قید
از فاطمہ رانا
Ig@aesthetienovels.online
Ig@aestheticnovels.online

قید از قلم فاطمہ رانا

(ترمیم شدہ مسودہ)

اس ناول کے تمام جملہ حقوق مصنفہ کے پاس محفوظ ہیں۔کاپی کرنے والے کے خلاف مصنفہ قانونی کاروائی کرنے کا حق رکھتی ہیں۔

اس کہانی کی اگر کسی کی ذاتی زندگی سے مطابقت ہوئی تو وہ محض اتفاقی ہو گی۔

منجانب: فاطمہ رانا

دو بہنیں، زرمین اور مشعل، اپنی محترمہ امی، ناہید بیگم کے ساتھ مل کر، ایک ڈھیر سارے کپڑوں میں سے کچھ کپڑے منتخب کر رہی تھیں، جو ان کے قریبی رشتے دار کی شادی میں پہننے کے لیے تھے۔ ناہید بیگم ان کے ساتھ کپڑے سلیکٹ کرنے میں مدد کر رہی تھی کیونکہ انہیں امید تھی کہ مہتاب صاحب اس بار لڑکیوں کو شادی میں جانے سے نہیں روکیں گے، کیونکہ شادی والے خاندان سے ان کے گہرے اور محکم تعلقات تھے۔ ان کی آنکھیں کپڑوں کی رنگینی میں کھو گئیں، اور ان کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ زرمین نے اپنی امی سے کہا، " امی، مجھے ان میں سے کون سا پہننا چاہیے؟ یہ سبز رنگ کا بہت خوبصورت ہے۔ "مشعل نے بھی اپنی رائے دی، " نہیں، آپی، یہ نیلے رنگ والا ٹھیک ہے۔ یہ سوٹ آپ پر بہت جچتا ہے۔ "ناہید بیگم نے دونوں بہنوں کو دیکھا اور مسکرائیں۔ " تم دونوں کو جو پسند ہو پہن لو، تم پر ہر رنگ اچھا لگتا ہے۔ لیکن اپنے ابو کی اجازت لینا نہ بھولنا۔ "یہ سارے کپڑے ان کی اپنے تھے، لیکن انہوں نے پہلے کبھی نہیں پہنے تھے، کیونکہ ان کے ابو، مہتاب صاحب، اپنی بیٹیوں کو بہت سخت روایات کے تحت رکھتے تھے۔ وہ انہیں کہیں ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے، نہ ہی عید تہوار پر انہیں سجنے سنورنے کی اجازت تھی، کیونکہ گھر میں تیار ہو کر انہوں نے کیا کرنا تھا؟

آج قسمت نے انہیں شادی میں سنہرے کپڑے، جلملاتی رنگین چوڑیاں، چمکتی دمکتی ہوئی جواہرات پہننے کا موقع دیا تھا۔ ان کی آنکھیں چمکتی ہوئی جواہرات سے جگمگا رہی تھیں،

اور ان کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ تھی جو ان کی خوشی کو ظاہر کر رہی تھی۔ لیکن مہتاب صاحب نے ان کی تیاری دیکھ کر انہیں اپنے مخصوص اور از حد سرد لہجے میں بڑی سفاکی سے شادی میں شرکت کرنے سے منع کر دیا۔ مہتاب صاحب کی آواز میں ایسا کچھ تھا کہ جس سن کر وہ کپکپا جاتی تھیں۔" تم لوگ گھر میں رہو گے، میں نے تمہیں شادی میں جانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ "مہتاب صاحب کی باتوں میں ایک ایسی سختی تھی جو ان کی بیٹیوں کے دل پر گہرا اثر ڈال رہی تھی۔ ان کی نظر میں ایک ایسی شدت اور تنگی تھی جو ان کی بیٹیوں کو بے حد مایوس اور پریشان کر رہی تھی۔

لیکن سامنے بھی زرمین کھڑی تھی، اس کا مزاج اتنا اچھا نہیں تھا کہ وہ آسانی سے ہتھیار ڈال دے۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی تیزی اور جوش تھا، جو اسے ہر چیلنج کا سامنا کرنے کی طاقت دیتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بڑھا کر کہا،" ابو، یہ کون سی بات ہوئی؟ "معراج انکل صرف ہمارے ہمسائے نہیں، بلکہ آپ کے قریبی دوست بھی ہیں اور انابیہ ہمیں اپنی بہنوں کی طرح سمجھتی ہے۔ اگر ہم اس کی شادی میں شریک نہیں ہوئے تو اسے بہت برا لگے گا۔ "زرمین نے کم آواز مگر پختہ لہجے میں احتجاج کیا۔ مہتاب صاحب نے اپنی بیٹی کی بات سن کر ٹھنڈے لہجے میں کہا،" زرمین، میں نے کہا ناں، تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شادی تو ہر حال میں ہو جائے گی۔ تم گھر میں رہو اور اپنا کام کرو۔ "زرمین کے دل میں اب ایک ہولناک لہر، دہشت انگیز سسکی، ایک مخدوش سہم، اور ایک بھیانک خاموشی تھی جو اسے مہتاب صاحب کے سامنے بولنے سے روک رہی تھی۔ زرمین کو خاموش ہوتا دیکھ کر مشعل نے آگے بڑھ کر التماسی لہجے میں کہا، " ابو، انابیہ آپی ہماری بہت اچھی اور پکی دوست بھی ہیں۔ ہم ان کی شادی میں جانا چاہتے ہیں۔ آج ان کی زندگی کا بہت اہم دن ہے۔ آپ ہمیں ساتھ لے جانے سے کیوں منع کر رہے ہیں؟ جبکہ آپ خود بھی وہیں جائیں گے، کیا آپ ہم سے محبت نہیں

کرتے؟ "مہتاب صاحب نے اپنی چھوٹی سی بیٹی کی بات سن کر مشفقانہ لہجے میں مسکرا کر کہا،" مشعل، میں تم دونوں سے محبت کرتا ہوں، لیکن میں تمہاری حفاظت کے لیے یہ کہہ رہا ہوں۔ تم دونوں اپنی امی کے ساتھ گھر میں رہو اور اپنا کام کرو۔ "زرمین کا غصہ مزید بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنے ابو کی بات سن کر وارفتگی سے کہا،" ابو، انابیہ ہم سے خفا ہو جائے گی۔ "مہتاب صاحب نے اپنی بیٹی کی بات سن کر کہا،" میں معذرت کر لوں گا لیکن تم لوگوں کو شادی میں جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

زرمین نے اپنے باپ کی بات سن کر اپنی آنکھیں جھپکیں شاید وہ اپنے الفاظ کو بڑی احتیاط سے چننے میں مصروف تھی، کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ اس کے الفاظ کا مہتاب صاحب پر ایک دیرپا، گہرا، ناقابل فراموش اور روح پرور اثر پڑے۔" ابو، میں سمجھتی ہوں کہ آپ کو ہماری محبت اور دوستی پر یقین نہیں ہے۔ "مہتاب صاحب نے اپنی بیٹی کی بات سن کر کہا،" زرمین، میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہاری حفاظت میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے بیٹا۔"

مہتاب صاحب کی آنکھوں میں محبت اُمڈنے کے ساتھ، ان کے لہجے میں ایک گہرائی اور نرمی بھی در آئی تھی، جو زرمین کے دل کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن زرمین کو اپنے باپ کی یہ محبت کی کوششیں محض ایک ظاہری دکھاوا لگتی تھیں، جو اس کے اندر گہری محبت کے بجائے قیدوں اور پابندیوں کا احساس دلاتی تھیں۔

وہ سمجھتی تھی کہ یہ محبت کی کوششیں اسے اپنی آزادی سے محروم کرنے اور خیالات کو محدود کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس کے لیے، اپنے باپ کی محبت کی کوششیں سراسر بے معنی الفاظ اور خالی وعیدیں کے سوا کچھ نہیں تھیں، جو اسے زندگی کو اپنے مطابق جینے سے روکتی تھیں۔

اس کے خیال میں، یہ محبت کی کوششیں اسے ایک قیدی کی طرح محسوس کرواتی تھیں، اور اسے اپنی زندگی کے بارے میں اپنے فیصلے کرنے سے روکتی تھیں۔ اس کے دل میں اپنے باپ کی محبت کی کوششیں ایک بے پناہ دباؤ تھا، جو اسے اپنے خود مختاری اور آزاد خیالی سے محروم کر رہا تھا۔

یہ محبت کی کوششیں اُس کیلئے محض ایک باریکی سے بنائی گئی قید تھی، جو اسے اپنی آزادی سے محروم کر رہی تھی۔ یہ محبت کی کوششیں اسے ایک اندرونی جنگ میں ڈال رہی تھیں، جہاں وہ اپنے باپ کی محبت کے ساتھ اپنی آزادی اور خود مختاری کے درمیان کی کشمکش میں الجھی ہوئی تھی۔ یہ جنگ اس کے اندر ایک گہری خلاء کو پیدا کر رہی تھی، جو اسے اپنے باپ کی محبت سے دور کر رہی تھی۔

زرمین کی آنکھوں میں امید کی وہ چمک دم توڑ چکی تھی۔ اس نے اپنے باپ مہتاب صاحب کی سخت گیر طبیعت کو پہلے بھی جھیلا تھا، لیکن آج انابیہ کی شادی کی بات پر پابندی کا طوفان اسے اُلٹا دھکیل رہا تھا۔ اس کی روح میں ایک گہرا زخم اُکھڑا تھا، جس سے درد کا لہو ٹپک ٹپک کر اس کے چہرے کو نم کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر سجی تلخ مسکراہٹ، آنکھوں میں بھرے آنسو، اور دل میں بسا وہ بے بسی کا اندھیرا، سب مل کر ایک ایسی تصویر بن رہے تھے جو زرمین کی روح کی حالت کا آئینہ بن رہی تھی۔ وہ اپنے باپ کی اس پابندی سے بے بس محسوس کر رہی تھی، اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی دنیا اندھیرے میں ڈوب رہی ہے۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

اندھیرا اپنے نرم پنکھوں سے کمرے کو چھپا رہا تھا، جیسے کوئی شفیق ماں اپنے بچے کو آغوش میں لے کر سکون دے رہی ہو۔ کبھی خوشیوں سے لبریز یہ کوچہ اب غموں کا گہوارہ بن چکا تھا۔ زرمین نے دروازہ زور سے بند کیا اور بستر پر اپنی تمام امیدوں کے ساتھ گر پڑی۔ کھڑکی سے چاندنی کی کرنیں آ رہی تھیں مگر اندر کا اندھیرا اس کی آنکھوں میں سما گیا تھا۔ وہ شادی کی رونقیں، مہندی کی خوشبو اور ڈھول کی دھماکے دار آوازوں سے دور، اپنی ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ انابیہ کی شادی، جس میں وہ شامل نہیں ہو سکی تھی، اس کے دل میں ایک گہرا زخم لے کر آئی تھی۔ یہ زخم نہ صرف اس کے جسم بلکہ اس کی روح کو بھی چیر رہا تھا، جیسے کوئی تیز دھار کا چاقو کسی نازک پنکھڑی کو چیر دے۔

ہر سانس کے ساتھ اس کے اندر ایک جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ایک طرف تو وہ اپنے والد کے فیصلے سے ناراض تھی، تو دوسری طرف ڈر کا سایہ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا، جیسے کوئی مغناطیس لوہے کی چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہو۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کا یہ راز افشا ہوا تو اسے کیا سزا ملے گی؟ مگر پھر بھی، اس نے اپنے فیصلے پر قائم رہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اب اس نے بستر پر تکیوں سے اپنی جگہ مرتب کی، گویا وہ ایک موم کی مورت بن چکی ہو، پھر چادر سے تکیوں کو اس طرح ڈھانپا کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر یہی سمجھے کہ وہ گہری نیند میں سوئی ہے۔ دل میں ایک طرف تو خوشی تھی کہ وہ اپنا منصوبہ کامیاب بنانے جا رہی ہے، تو دوسری طرف ڈر بھی تھا کہ کہیں اس کا یہ راز افشا نہ ہو جائے۔ ڈر کا یہ سایہ اس کے دل میں اسی طرح سایہ فگن تھا جیسے بادلوں کا سایہ چاندنی رات میں چاند پر پڑتا ہو۔ شادی کا جوش، بغاوت کا جذبہ اور ڈر کا سایہ دل میں سموئے زرمین نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو شادی کی رونقیں، مہندی کی خوشبو، گانے کی دھنیں، اور ہنسی کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی ہوئیں اسے اپنی طرف آنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ لیکن اچانک اس

کے اندر ایک آواز نے اسے روک لیا۔ وہ آواز اسے بتا رہی تھی کہ وہ اپنے باپ کی نافرمانی نہیں کر سکتی۔ اس کے اندر ایک کشمکش تھی، ایک طرف تو اس کی اپنی خواہش اور دوسری طرف باپ کے فیصلے کا احترام۔ یہ کشمکش اس کے دل میں اسی طرح اٹھ رہی تھی جیسے سمندر میں لہریں اٹھتی ہیں اور پھر ٹوٹ جاتی ہیں۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے اندر کئی سوالوں کا طوفان اُمڈ آیا۔ وہ اپنے ارادے سے کیوں ہٹ رہی ہے؟ وہ اپنے باپ کی بات ماننے پر مجبور کیوں ہے؟ آخر وہ کیوں اتنی کمزور ہے؟ لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے والدین سے بہت پیار کرتی ہے اور وہ انہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔ اسے لگا جیسے وہ ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور اسے فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس راستے پر چلے۔

مایوسی کے اندھیروں میں گم ہو کر، اس کا وجود بے جان سا ہو گیا تھا۔ آنسوؤں کے موتی اس کے رخساروں پر لڑھک رہے تھے، جیسے کوئی ستارہ آسمان سے زمین پر گر رہا ہو۔ اپنے اندرونی درد سے نڈھال ہو کر، وہ بے بسی سے اپنے بستر کی جانب بڑھی، جیسے کوئی تھکا ہوا پرندہ اپنے گھونسلے میں پناہ لینے آ رہا ہو۔

پھر اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑی چوڑیاں اپنے ہاتھوں میں تھام لیں اور انہیں محسوس کیا۔ یہ چوڑیاں اس کی خوشیوں اور غموں کی گواہ تھیں۔ لیکن آج یہ چوڑیاں اسے بوجھ لگ رہی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ چوڑیاں اس کی آزادی کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر بیڈ پر پھینک دیا اور چوڑیاں اپنے ہاتھوں میں حسرت زدگی سے توڑ ڈالیں۔ اس کے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ وہ خود کو بہت اکیلی محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ دنیا میں اکیلی لڑکی ہو جسے کوئی نہیں سمجھتا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ سے کہا، " میں یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہوں؟ "اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے وہ اپنے اندر گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

زرمین کا یہ اندرونی سفر ایک دردناک سچائی کی طرف لے جا رہا تھا۔ ایک طرف تو وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنا چاہتی تھی، تو دوسری طرف وہ اپنے خاندان اور معاشرے کی توقعات پر بھی پورا اترنا چاہتی تھی۔ اس کے دل میں ایک بڑا تضاد تھا۔ وہ ایک طرف تو بغاوت کرنا چاہتی تھی، تو دوسری طرف وہ اپنے والدین کے لیے بے حد احترام محسوس کرتی تھی۔

~~~~~~~~~

"مشعل کی آنکھیں، مانسوں کی پگھلی ہوئی بوندوں سے سیراب، نم ہو چکی تھیں۔ اس کا دل ایک بے چین سمندر کی مانند موجوں سے اٹھ رہا تھا۔ کتابیں سمیٹتے ہوئے، وہ اپنی ماں کی طرف دیکھتی ہوئی مضطربانہ لہجے میں بولی۔ 'امی، مجھے معلوم ہے کہ ابو جان نے ہمیں انا آپی کی شادی میں نہ جانے دینے کا فیصلہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہو گا۔ لیکن زری آپی کو اتنا دکھ ہوا ہے! آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ کیسی خوش تھی اس شادی کو لے کر۔ وہ انا آپی کی بہت اچھی دوست ہے اور دونوں بچپن سے ساتھ رہتی آئیں ہیں۔' مشعل کی آواز میں ایک دبی ہوئی حسرت تھی، جیسے کوئی تار اس کی روح کو چھو رہا ہو۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی، 'ابو جان کا زری آپی کو منع کرنا ان کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ وہ خود کو کمرے میں بند کر کے بیٹھی ہے۔'
~~~~~~~~~

"ناہید بیگم نے مشعل کو اپنے گلے لگایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، 'بیٹا، زرمین کا انابیہ کے لیے اتنا محبت کرنا بہت فطری بات ہے۔ دونوں کی دوستی بہت گہری ہے۔ لیکن مشعل بیٹا، یہ دنیا اتنی سادہ نہیں جتنی ہم سمجھتے ہیں۔ زرمین کا تعلق صرف انابیہ سے ہے، وہ اُسکے خاندان والوں کو نہیں جانتی کہ وہ کیسے لوگ ہیں، اور نہ ہی ہم جانتے کہ وہاں کیا ماحول ہو گا۔ شاید کچھ لوگ ان دونوں کی قربت کو غلط انداز سے لیں یا زرمین کیلئے تنگی کا سبب بنے۔ تمھارے ابو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ زرمین کو کسی تکلیف یا شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔' مشعل کی آنکھوں میں اشک جمع ہو گئے۔ 'امی، آپ کی بات میں وزن ہے لیکن کیا محبت کو صرف خوف کی وجہ سے روکا جا سکتا ہے؟ کیا دو بہنوں کی دوستی کو صرف سماجی دباؤ کی وجہ سے توڑا جا سکتا ہے؟' مشعل کی آواز میں ایک احتجاجی لہجہ تھا۔"

مشعل تمہارے ابو نہیں چاہتے کہ اُنکی بیٹیوں کو کوئی دکھ پہنچے۔ بس وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید انابیہ کی شادی میں جانے سے زرمین کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔' مشعل نے اپنی ماں کی بات غور سے سنی، لیکن مشکلات کیسی وہ سمجھ نہیں پائی۔ اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اس کے ابو اسے اور زرمین کو بہت پیار کرتے تھے۔ وہ صرف ان کی بھلائی چاہتے تھے۔ لیکن مشعل کی آنکھوں میں ایک اور سوال چمک رہا تھا۔ کیا محبت کا رشتہ صرف روایات اور سماجی دباؤ کی قید میں جکڑا رہ سکتا ہے؟ کیا دو بہنوں کی دوستی کو اتنی آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے؟ کیا محبت کو اصولوں کی زنجیر میں جکڑنا درست ہے؟ کیا محبت کو خوف سے بڑا نہیں ہونا چاہیے؟"

~~~~~~~~~
~~~~~~~~~

"صبح کی دھندلی سی روشنی کھڑکی سے اندر آکر کمرے میں سرایت کر رہی تھی، جیسے کوئی شفاف پردہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہو، مگر ناشتے کی میز پر بیٹھے مہتاب صاحب کے دل میں ایک گہرا سناٹا سا چھا ہوا تھا۔ چائے کا گرم کپ ہاتھ میں لیے، وہ اپنی بیوی ناہید بیگم کی طرف ایک نظریں دوڑائی جو چپ چاپ بیٹی کا انتظار کر رہی تھی۔ چائے کی گرم بھاپ ان کے چہرے پر اٹھ رہی تھی، جیسے کہ وہ اپنے اندرونی اضطراب کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"زرمین ناشتے کے لیے نہیں آئی؟ "ان کا لہجہ پرسکون تھا لیکن اندرونی بے چینی کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ ناہید بیگم نے سر جھکا لیا اور چھوٹی سی مشعل کی طرف دیکھا جو خاموشی سے اپنی بڑی بہن کے کمرے کی جانب منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کمرے سے ایک دھیمی سی آواز آئی، جیسے کوئی پنکھڑی آہستہ سے زمین پر گر رہی ہو۔ دروازے کی قدیم کندی کی آہٹ نے سناٹے کو چیر دیا اور لکڑی کا بنا ہوا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ زرمین باہر نکلی۔ گزشتہ رات کا المناک واقعہ اس کے چہرے پر ایک گہرے زخم کی مانند نقش ہو گیا تھا۔ متورم آنکھیں، فکا سا چہرہ، اور لرزتے ہوئے ہونٹ اس کی روح کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی تکلیف کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ جیسے کوئی مایوس رنگ ایک سفید کپڑے پر پھیل گیا ہو، اس کا چہرہ بھی غم کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس نے ڈائننگ ٹیبل کی طرف دیکھا اور سرد مہری سے کہا، " جی ابو، میں تیار ہوں یونیورسٹی جانے کے لیے۔ "انابیہ کی شادی کا غم اس کے دل میں گہرا اتر چکا تھا، جیسے کوئی کانٹا اس کے دل میں گڑا ہوا ہو۔ مہتاب صاحب نے نرمی سے کہا، " بیٹا، ناشتہ کر لو پہلے، پھر میں تمہیں یونیورسٹی چھوڑ آؤں گا۔ "زرمین نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مہتاب صاحب کے سخت لہجے نے اسے روک دیا۔ " بیٹا، تمہیں معلوم ہے کہ گھر کے اصولوں کے مطابق لڑکیوں کو اکیلے

جانے کی اجازت نہیں ہے۔ "زرمین کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اسے اپنے باپ کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا، لیکن وہ جانتے ہوئے کہ وہ ان کے خلاف نہیں جا سکتی، خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل ایک تاریک گہرا کنواں تھا، جس میں اس کی تمام تلخیاں اور غم جمع ہو رہے تھے۔ ہر آنسو ایک قطرے کی مانند اس کنویں میں گرتا تھا اور اس کی گہرائی کو بڑھا دیتا تھا۔ ناہید بیگم نے فوراً اس کی پلیٹ میں پراٹھا اور چائے کا بھرا کپ اس کے سامنے رکھا۔ مہتاب صاحب کی تیز نظروں کی تپش سے جھلس کر زرمین نے بے رخی کا نقاب اوڑھ لیا اور بے بس ہو کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اب ناہید بیگم نے اپنی بیٹی کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا، لیکن زرمین کی آنکھیں کسی اور ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھیں، جیسے کوئی ستارا تاروں کے سمندر میں کھو گیا ہو۔ مشعل نے اپنی بہن کی طرف ایک ہمدردی بھری نگاہ ڈالی۔ لیکن زرمین کا دل اس وقت صرف انابیہ کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔"

IG:AESTHETICNOVELS.ONLINE

قسط نمبر 1

ایک درمیانے گھر کی دوسری منزل والے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا جائے تو، اندر کا منظر کچھ یوں تھا۔

ناہید بیگم، اپنی دو بیٹیوں، زرمین اور مشعل کے ساتھ، ڈھیر سارے کپڑوں میں سے کچھ لباس منتخب کر رہی تھیں۔ یہ انتخاب ان کے ایک قریبی رشتے دار کی شادی کے لیے ہو رہا تھا۔ انہیں امید تھی کہ مہتاب صاحب اس بار لڑکیوں کو شادی میں جانے سے نہیں روکیں گے، کیونکہ شادی والے خاندان سے ان کے گہرے اور محکم تعلقات تھے۔

ان کی آنکھیں کپڑوں کی رنگینی میں کھو گئیں، اور ان کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

زرمین نے اپنی امی سے پرجوش اور متجسس انداز میں پوچھا، جس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر معصومیت و خوشی کے تاثرات تھے، جیسے وہ جلد از جلد اپنی پسند کا لباس پہن کر تیار ہونا چاہتی ہو:

"امی، مجھے ان میں سے کون سا پہننا چاہیے؟"

مشعل، جس کے سراپا میں معصومیت اور چھوٹے ہونے کا گمان ہوتا تھا اور ہر کوئی اسے

بے پناہ محبت کرتا تھا، اس نے پہلے اپنی رائے دی:

"یہ سبز رنگ کا بہت خوبصورت ہے۔"

پھر، اس نے فوراً اپنی رائے بدلتے ہوئے کہا:

"نہیں نہیں، آپی، یہ نیلے رنگ والا ٹھیک ہے۔ یہ سوٹ آپ پر بہت جچتا ہے۔"

ناہید بیگم نے دونوں بہنوں کو دیکھا اور مسکرائیں۔

"تم دونوں کو جو پسند ہو پہن لو، تم پر ہر رنگ اچھا لگتا ہے۔ لیکن اپنے ابو کی اجازت لینا نہ بھولنا۔"

یہ سارے کپڑے ان کے اپنے تھے، لیکن انہوں نے پہلے کبھی نہیں پہنے تھے، کیونکہ ان کے ابو، مہتاب صاحب، اپنی بیٹیوں کو بہت سخت روایات کے تحت رکھتے تھے۔ وہ انہیں کہیں ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے، نہ ہی عید تہوار پر انہیں سجنے سنورنے کی اجازت تھی، کیونکہ گھر میں تیار ہو کر انہوں نے کیا کرنا تھا؟

آج قسمت نے انہیں شادی میں سنہرے کپڑے، جھلملاتی رنگین چوڑیاں، چمکتے دمکتے ہوئے جواہرات پہننے کا موقع دیا تھا۔ ان کی آنکھیں چمکتی ہوئی جواہرات سے جگمگا رہی تھیں، اور ان کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ تھی جو ان کی خوشی کو ظاہر کر رہی تھی۔

لیکن مہتاب صاحب نے ان کی تیاری دیکھ کر انہیں اپنے مخصوص اور از حد سرد لہجے میں بڑی سفاکی سے شادی میں شرکت کرنے سے منع کر دیا۔ مہتاب صاحب کی آواز میں ایسا کچھ تھا کہ جسے سن کر وہ کپکپا جاتی تھیں۔

"تم لوگ گھر میں رہو گی، میں نے تمہیں شادی میں جانے کی اجازت نہیں دی ہے۔"

مہتاب صاحب کی باتوں میں ایک ایسی سختی تھی جو ان کی بیٹیوں کے دل پر گہرا اثر ڈالتی تھی۔ ان کی نظر میں ایک ایسی سنجیدگی اور تنگی تھی جو ان کی بیٹیوں کو بے حد مایوس اور

پریشان کرتی تھی۔

لیکن سامنے زرمین کھڑی تھی، اس کا مزاج اتنا اچھا نہیں تھا کہ وہ آسانی سے ہتھیار ڈال دے۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی تیزی اور جوش تھا جو اسے ہر چیلنج کا سامنا کرنے کی طاقت دیتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بڑھا کر کہا:

"ابو، یہ کون سی بات ہوئی؟ معراج انکل صرف ہمارے ہمسائے نہیں، بلکہ آپ کے قریبی دوست بھی ہیں اور انابیہ ہمیں اپنی بہنوں کی طرح سمجھتی ہے۔ اگر ہم اس کی شادی میں شریک نہیں ہوئے تو اسے بہت برا لگے گا۔"

زرمین نے کم آواز مگر پختہ لہجے میں احتجاج کیا۔ مہتاب صاحب نے اپنی بیٹی کی بات سن کر ٹھنڈے لہجے میں کہا:

"زرمین، میں نے کہا ناں، تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شادی تو ہر حال میں ہو جائے گی۔ تم گھر میں رہو اور اپنا کام کرو۔"

زرمین کے دل میں اب ایک مخدوش سہم تھی جو اسے مہتاب صاحب کے سامنے بولنے سے روک رہی تھی ۔

زرمین کو خاموش ہوتا دیکھ کر مشعل نے آگے بڑھ کر التماسی لہجے میں کہ:

"ابو، انابیہ آپی ہماری بہت اچھی اور پکی دوست بھی ہیں۔ ہم ان کی شادی میں جانا چاہتے ہیں۔ آج ان کی زندگی کا بہت اہم دن ہے۔ آپ ہمیں ساتھ لے جانے سے کیوں منع کر رہے ہیں؟ جبکہ آپ خود بھی وہیں جائیں گے، کیا آپ ہم سے محبت نہیں کرتے؟"

مہتاب صاحب نے اپنی چھوٹی سی بیٹی کی بات سن کر مشفقانہ لہجے میں مسکرا کر کہا:

"مشعل، میں تم دونوں سے محبت کرتا ہوں، لیکن میں تمہاری حفاظت کے لیے یہ کہہ رہا ہوں۔ تم دونوں اپنی امی کے ساتھ گھر میں رہو اور اپنا کام کرو۔"

زرمین کا غصہ مزید بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنے ابو کی بات سن کر وارفتگی سے کہا:

"ابو، انا بیہ ہم سے خفا ہو جائے گی۔"

مہتاب صاحب نے اپنی بیٹی کی بات سن کر کہا:

"میں معذرت کر لوں گا لیکن تم لوگوں کو شادی میں جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

زرمین نے اپنے باپ کی بات سن کر اپنی آنکھیں جھپکیں، شاید وہ اپنے الفاظ کو بڑی احتیاط سے چننے میں مصروف تھی، کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ اس کے الفاظ کا مہتاب صاحب پر ایک دیرپا اور گہرا اثر پڑے۔

"ابو، میں سمجھتی ہوں کہ آپ کو ہماری محبت اور دوستی پر یقین نہیں ہے۔"

مہتاب صاحب نے اپنی بیٹی کی بات سن کر کہا:

"زرمین، میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہاری حفاظت میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے بیٹا۔"

مہتاب صاحب کی آنکھوں میں محبت اُمڈنے کے ساتھ، ان کے لہجے میں ایک گہرائی اور نرمی بھی در آئی تھی، جو زرمین کی سوچ بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن زرمین کو اپنے باپ کی یہ محبت کی کوششیں محض ایک ظاہری دکھاوا لگتی تھیں، جو اس کے اندر گہری محبت کے بجائے قیدوں اور پابندیوں کا احساس دلاتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ محبت کی کوششیں اسے اپنی آزادی سے محروم کرنے اور خیالات کو محدود کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس کے لیے، اپنے باپ کی محبت کی کوششیں سراسر بے معنی الفاظ اور خالی سرابِ شفقت کے سوا کچھ نہیں تھیں، جو اسے زندگی کو اپنے مطابق جینے سے روکتی تھیں۔

اس کے خیال میں، یہ محبت کی کوششیں اسے ایک قیدی کی طرح محسوس کرواتی تھیں، اور اسے اپنی زندگی کے بارے میں اپنے فیصلے کرنے سے روکتی تھیں۔ اس کے دل میں

اپنے باپ کی محبت کی کوششیں ایک بے پناہ دباؤ تھا، جو اسے اپنے خود مختاری اور آزاد خیالی سے محروم کر رہا تھا۔

یہ محبت کی کوششیں اُس کیلئے محض ایک باریکی سے بنائی گئی قید تھی، جو اسے اپنی آزادی سے محروم کر رہی تھی۔ یہ محبت کی کوششیں اسے ایک اندرونی جنگ میں ڈال رہی تھیں، جہاں وہ اپنے باپ کی محبت کے ساتھ اپنی آزادی اور خود مختاری کے درمیان کی کشمکش میں الجھی ہوئی تھی۔ یہ جنگ اس کے اندر ایک گہری خلاء کو پیدا کر رہی تھی، جو اسے اپنے باپ کی محبت سے دور کر رہی تھی۔

زرمین کی آنکھوں میں امید کی وہ چمک دم توڑ چکی تھی۔ اس نے اپنے باپ مہتاب صاحب کی سخت گیر طبیعت کو پہلے بھی جھیلا تھا، لیکن آج انابیہ کی شادی کی بات پر پابندی کا طوفان اسے اُلٹا دھکیل رہا تھا۔ اس کی روح میں ایک گہرا زخم اُکھڑا تھا، جس سے درد کا لہو ٹپک ٹپک کر اس کے چہرے کو نم کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر سجی تلخ مسکراہٹ، آنکھوں میں بھرے آنسو، اور دل میں بسا وہ بے بسی کا اندھیرا، سب مل کر ایک ایسی تصویر بن رہے تھے جو زرمین کی روح کی حالت کا آئینہ بن رہی تھی۔ وہ اپنے باپ کی اس پابندی سے بے بس محسوس کر رہی تھی، اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی دنیا اندھیرے میں ڈوب رہی ہے۔

..☆...☆...☆..

اندھیرا اپنے نرم پنکھوں سے کمرے کو چھپا رہا تھا، جیسے کوئی شفیق ماں اپنے بچے کو آغوش میں لے کر سکون دے رہی ہو۔ کبھی خوشیوں سے لبریز یہ گوشہ اب غموں کا گہوارہ بن چکا تھا۔ زرمین نے دروازہ زور سے بند کیا اور بستر پر اپنی تمام امیدوں کے ساتھ گر پڑی۔

کھڑکی سے چاندنی کی کرنیں آ رہی تھیں مگر اندر کا اندھیرا اس کی آنکھوں میں سما گیا تھا۔ وہ شادی کی رونقیں، مہندی کی خوشبو اور ڈھول کی دھماکے دار آوازوں سے دور، اپنی ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ انابیہ کی شادی، جس میں وہ شامل نہیں ہو سکی تھی، اس کے دل میں ایک گہرا زخم لے کر آئی تھی۔ یہ زخم نہ صرف اس کے جسم بلکہ اس کی روح کو بھی چیر رہا تھا، جیسے کوئی تیز دھار کا چاقو کسی نازک پنکھڑی کو چیر دے۔

ہر سانس کے ساتھ اس کے اندر ایک جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ایک طرف تو وہ اپنے والد کے فیصلے سے ناراض تھی، تو دوسری طرف ڈر کا سایہ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا، جیسے کوئی مقناطیس لوہے کی چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہو۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کا یہ راز افشا ہوا تو اسے کیا سزا ملے گی؟ مگر پھر بھی، اس نے اپنے فیصلے پر قائم رہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اب اس نے بستر پر تکیوں سے اپنی جگہ مرتب کی، گویا وہ ایک موم کی مورت بن چکی ہو، پھر چادر سے تکیوں کو اس طرح ڈھانپا کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر یہی سمجھے کہ وہ گہری نیند میں سوئی ہے۔ دل میں ایک طرف تو خوشی تھی کہ وہ اپنا منصوبہ کامیاب بنانے جا رہی ہے، تو دوسری طرف ڈر بھی تھا کہ کہیں اس کا یہ راز افشا نہ ہو جائے۔ ڈر کا یہ سایہ اس کے دل میں اسی طرح سایہ فگن تھا جیسے بادلوں کا سایہ چاندنی رات میں چاند پر پڑتا ہو۔ شادی کا جوش، بغاوت کا جذبہ اور ڈر کا سایہ دل میں سموئے زرمین نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو شادی کی رونقیں، مہندی کی خوشبو، گانے کی دھنیں، اور ہنسی کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی ہوئیں اسے اپنی طرف آنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ لیکن اچانک اس کے اندر ایک آواز نے اسے روک لیا۔ وہ آواز اسے بتا رہی تھی کہ وہ اپنے باپ کی نافرمانی نہیں کر سکتی۔ اس کے اندر ایک کشمکش تھی، ایک طرف تو اس کی اپنی خواہش اور دوسری طرف باپ کے فیصلے کا احترام۔ یہ کشمکش اس کے دل میں اسی طرح اٹھ رہی تھی

جیسے سمندر میں لہریں اٹھتی ہیں اور پھر ٹوٹ جاتی ہیں۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے اندر کئی سوالوں کا طوفان اُمڈ آیا۔ وہ اپنے ارادے سے کیوں ہٹ رہی ہے؟ وہ اپنے باپ کی بات ماننے پر مجبور کیوں ہے؟ آخر وہ کیوں اتنی کمزور ہے؟ لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے والدین سے بہت پیار کرتی ہے اور وہ انہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔ اسے لگا جیسے وہ ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور اسے فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس راستے پر چلے۔

مایوسی کے اندھیروں میں گم ہو کر، اس کا وجود بے جان سا ہو گیا تھا۔ آنسوؤں کے موتی اس کے رخساروں پر لڑھک رہے تھے، جیسے کوئی ستارہ آسمان سے زمین پر گر رہا ہو۔

اپنے اندرونی درد سے نڈھال ہو کر، وہ بے بسی سے اپنے بستر کی جانب بڑھی، جیسے کوئی تھکا ہوا پرندہ اپنے گھونسلے میں پناہ لینے آ رہا ہو۔

پھر اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑی چوڑیاں اپنے ہاتھوں میں تھام لیں اور انہیں محسوس کیا۔ یہ چوڑیاں اس کی خوشیوں اور غموں کی گواہ تھیں۔ لیکن آج یہ چوڑیاں اسے بوجھ لگ رہی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ چوڑیاں اس کی آزادی کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔

اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر بیڈ پر پھینک دیا اور چوڑیاں اپنے ہاتھوں میں حسرت زدگی سے توڑ ڈالیں۔ اس کے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ وہ خود کو بہت اکیلی محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ دنیا میں اکیلی لڑکی ہو جسے کوئی نہیں سمجھتا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ سے کہا:

"میں یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہوں؟"

اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے وہ اپنے اندر گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

زرمین کا یہ اندرونی سفر ایک دردناک سچائی کی طرف لے جا رہا تھا۔ ایک طرف تو وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنا چاہتی تھی، تو دوسری طرف وہ اپنے خاندان اور معاشرے کی

توقعات پر بھی پورا اترنا چاہتی تھی۔ اس کے دل میں ایک بڑا تضاد تھا۔ وہ ایک طرف تو بغاوت کرنا چاہتی تھی، تو دوسری طرف وہ اپنے والدین کے لیے بے حد احترام محسوس کرتی تھی۔

~~~~~~

"مشعل کی آنکھیں، آنسوؤں کی پگھلی ہوئی بوندوں سے سیراب، نم ہو چکی تھیں۔ اس کا دل ایک بے چین سمندر کی مانند موجوں سے اٹھ رہا تھا۔ کتابیں سمیٹتے ہوئے، وہ اپنی ماں کی طرف دیکھتی ہوئی مضطربانہ لہجے میں بولی:

"امی، مجھے معلوم ہے کہ ابو جان نے ہمیں انا آپی کی شادی میں نہ جانے دینے کا فیصلہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہو گا۔ لیکن زری آپی کو اتنا دکھ ہوا ہے! آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ کیسی خوش تھی اس شادی کو لے کر۔ وہ انا آپی کی بہت اچھی دوست ہے اور دونوں بچپن سے ساتھ رہتی آئی ہیں۔"

مشعل کی آواز میں ایک دبی ہوئی حسرت تھی، جیسے کوئی تار اس کی روح کو چھو رہا ہو۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی:

"ابو جان کا زری آپی کو منع کرنا ان کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ وہ خود کو کمرے میں بند کر کے بیٹھی ہے۔"

ناہید بیگم نے مشعل کو اپنے گلے لگایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"بیٹا، زرمین کا انابیہ کے لیے اتنا محبت کرنا بہت فطری بات ہے۔ دونوں کی دوستی بہت گہری ہے۔ لیکن مشعل بیٹا، یہ دنیا اتنی سادہ نہیں جتنی ہم سمجھتے ہیں۔ زرمین کا تعلق صرف انابیہ سے ہے، وہ اس کے خاندان والوں کو نہیں جانتی کہ وہ کیسے لوگ ہیں، اور نہ
~~~~~~

ہی ہم جانتے کہ وہاں کیا ماحول ہو گا۔ شاید کچھ لوگ ان دونوں کی قربت کو غلط انداز سے لیں یا زرمین کے لیے تنگی کا سبب بنے۔ تمھارے ابو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ زرمین کو کسی تکلیف یا شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

مشعل کی آنکھوں میں اشک جمع ہو گئے۔

"امی، آپ کی بات میں وزن ہے لیکن کیا محبت کو صرف خوف کی وجہ سے روکا جا سکتا ہے؟ کیا دو بہنوں کی دوستی کو صرف سماجی دباؤ کی وجہ سے توڑا جا سکتا ہے؟"

مشعل کی آواز میں ایک احتجاجی لہجہ تھا۔

"مشعل، تمہارے ابو نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹیوں کو کوئی دکھ پہنچے۔ بس وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید انابیہ کی شادی میں جانے سے زرمین کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔"

مشعل نے اپنی ماں کی بات غور سے سنی، لیکن مشکلات کیسی وہ سمجھ نہیں پائی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے ابو اسے اور زرمین کو بہت پیار کرتے تھے۔ وہ صرف ان کی بھلائی چاہتے تھے۔ لیکن مشعل کی آنکھوں میں ایک اور سوال چمک رہا تھا۔ کیا محبت کا رشتہ صرف روایات اور سماجی دباؤ کی قید میں جکڑا رہ سکتا ہے؟ کیا دو بہنوں کی دوستی کو اتنی آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے؟ کیا محبت کو اصولوں کی زنجیر میں جکڑنا درست ہے؟ کیا محبت کو خوف سے بڑا نہیں ہونا چاہیے؟

~~~~~~~

صبح کی دھندلی سی روشنی کھڑکی سے اندر آ کر کمرے میں سرایت کر رہی تھی، جیسے کوئی شفاف پردہ آہستہ آہستہ کھل رہا ہو، مگر ناشتے کی میز پر بیٹھے مہتاب صاحب کے دل میں ایک گہرا سناٹا سا چھا ہوا تھا۔ چائے کا گرم کپ ہاتھ میں لیے، وہ اپنی بیوی ناہید بیگم کی
~~~~~~~

طرف نظریں دوڑائیں جو چپ چاپ بیٹی کا انتظار کر رہی تھی۔ چائے کی گرم بھاپ ان کے چہرے پر اٹھ رہی تھی، جیسے کہ وہ اپنے اندرونی اضطراب کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

مہتاب صاحب نے پوچھا:

"زرمین ناشتے کے لیے نہیں آئی؟"

ان کا لہجہ پرسکون تھا لیکن اندرونی بے چینی کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ ناہید بیگم نے سر جھکا لیا اور چھوٹی سی مشعل کی طرف دیکھا جو خاموشی سے اپنی بڑی بہن کے کمرے کی جانب منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کمرے سے ایک دھیمی سی آواز آئی، جیسے کوئی پنکھڑی آہستہ سے زمین پر گر رہی ہو۔ دروازے کی قدیم کنڈی کی آہٹ نے سناٹے کو چیر دیا اور لکڑی کا بنا ہوا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ زرمین باہر نکلی۔ گزشتہ رات کا المناک واقعہ اس کے چہرے پر ایک گہرے زخم کی مانند نقش ہو گیا تھا۔ متورم آنکھیں، پھیکا سا چہرہ، اور لرزتے ہوئے ہونٹ اس کی روح کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی تکلیف کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ جیسے کوئی مایوس رنگ ایک سفید کپڑے پر پھیل گیا ہو، اس کا چہرہ بھی غم کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس نے ڈائننگ ٹیبل کی طرف دیکھا اور سرد مہری سے کہا:

"جی ابو، میں تیار ہوں یونیورسٹی جانے کے لیے۔"

انابیہ کی شادی کا غم اس کے دل میں گہرا اتر چکا تھا، جیسے کوئی کانٹا اس کے دل میں گڑا ہوا ہو۔ مہتاب صاحب نے نرمی سے کہا:

"بیٹا، ناشتہ کر لو پہلے، پھر میں تمہیں یونیورسٹی چھوڑ آؤں گا۔"

زرمین نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مہتاب صاحب کے سخت لہجے نے اسے روک لیا:

"بیٹا، تمہیں معلوم ہے کہ گھر کے اصولوں کے مطابق لڑکیوں کو اکیلے جانے کی اجازت

نہیں ہے۔"

زرمین کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اسے اپنے باپ کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا، لیکن وہ جانتے ہوئے کہ وہ ان کے خلاف نہیں جا سکتی، خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل ایک تاریک گہرا کنواں تھا، جس میں اس کی تمام تلخیاں اور غم جمع ہو رہے تھے۔ ہر آنسو ایک قطرے کی مانند اس کنویں میں گرتا تھا اور اس کی گہرائی کو بڑھا دیتا تھا۔ ناہید بیگم نے فوراً اس کی پلیٹ میں پراٹھا اور چائے کا بھرا کپ اس کے سامنے رکھا۔ مہتاب صاحب کی تیز نظروں کی تپش سے جھلس کر زرمین نے بے رخی کا نقاب اوڑھ لیا اور بے بس ہو کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اب ناہید بیگم نے اپنی بیٹی کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا، لیکن زرمین کی آنکھیں کسی اور ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھیں، جیسے کوئی ستارا تاروں کے سمندر میں کھو گیا ہو۔ مشعل نے اپنی بہن کی طرف ایک ہمدردی بھری نگاہ ڈالی۔ لیکن زرمین کا دل اس وقت صرف انابیہ کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔

..☆...☆...☆..

ماضی کی تلخ یادوں میں دور کہیں گم سلمان رضا گیلانی، میر انڈسٹری کے ڈپارٹمنٹ میں ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا کاشان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں کرسی کے ہتھے پر عادتاً چل رہی تھیں جیسے نادیدہ پیانو بجا رہی ہوں۔ جبکہ بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ کو اس نے اپنے عنابی لبوں سے لگا کر کش لگایا تو دھوئیں کے مرغولے عجیب و غریب اشکال بناتے ہوئے کمرے میں محو رقصاں ہوئے، فضا کو آلودہ کرتے لمحے میں اس کے آج اور آنے والے دنوں کی طرح مدھم پڑنے لگے۔

میر انڈسٹری کے تمام ملازمین سلمان رضا گیلانی کو جانتے تھے۔ وہ اکثر ہوا کی طرح آتا اور قیامت کا طوفان برپا کر جاتا۔ سب اس سے ڈرتے تھے، اس میں غلطی اس کی نہیں اس کے ماضی کی تھی۔ جو کچھ ایسا تھا کہ اس کے مزاج کو تلخ کر گیا تھا۔

دودھ میں شکر سی رنگت، مصری دوشیزہ سے مشابہت رکھتے اس کے نین نقش اور نو میک اپ لک میں دوپٹہ اچھی طرح شانوں پر پھیلائے سلیقے سے سر پر اوڑھے ہوئے وہ پری پیکر بیحد حسین، سر تا پاؤں آفتِ دل لڑکی آسمان سے زمین پر اتری کوئی پری معلوم ہو رہی تھی۔ جس کی مسکراہٹ سنہری دن کی پہلی کرن کی طرح اور آنکھیں چمکتے تاروں کی مانند تھیں۔

اس کے آفس میں قدم رکھتے ہی اطراف میں سلامتی کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ جواباً ملازمین کی آوازوں میں خوف کی لرزش کو محسوس کیے بغیر دلکش مسکراہٹ اور مثبت تاثرات کے ساتھ وہ اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دیتی ایک ادا سے آگے بڑھ رہی تھی۔

یونہی سلمان رضا گیلانی کی موجودگی کا ذکر ہوا تو ملازمین کی سانسوں میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کی موجودگی نے ان کے دلوں میں بے کراں خلا پیدا کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ سلمان کی موجودگی ان کے لیے کتنی خطرناک ہو سکتی ہے اور اب یہ نئی لڑکی بھی اس خطرے کا حصہ بن رہی تھی۔

ریسیپشنسٹ نے بلانے پر اس نے مڑ کر اس کی سمت دیکھا:

"مشعل مم۔۔۔۔۔۔"!!

ریسیپشنسٹ نے سرعت سے بتایا، آواز میں اضطراب کا عنصر نمایاں تھا:

"مم وہ کاشان سر۔۔۔۔۔۔۔ اپنے ڈپارٹمنٹ میں موجود نہیں ہیں ۔۔۔"!!

مشعل کچھ بولتی کہ اسے ڈپارٹمنٹ میں کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ ریسیپشنسٹ کی گھبراہٹ کو نظر میں رکھتے مشعل نے ڈپارٹمنٹ کا رخ کیا جبکہ پیچھے وہ لب بستہ کھڑی

سراسیمگی سے انگلیاں مختلف زاویوں میں مروڑنے لگی۔

وہ ڈیپارٹمنٹ کی سمت بڑھتی آرہی تھی کہ یکلخت اس کی نگاہ کمرے کی گلاس ونڈو پر جا کر ٹھہری (جہاں کانچ کی پانچ مختلف رنگوں کی گیندیں الٹا لٹکتی کمرے کی سجاوٹ کو دوبالا کرتے آرپار کے سارے مناظر خاموشی سے دیکھ رہی تھیں)۔ بڑھتے قدموں کے ساتھ مشعل کی نگاہ اب کمرے میں موجود لڑکے پر گئی تو اس کے قدم ایک جگہ منجمد ہوتے ہی وہ ساکت وجامد حیرانگی کی تصویر بنے گلاس ونڈو سے اندر کا منظر دیکھنے لگی۔

وہ جو کوئی بھی تھا اس کا چہرہ مشعل سے مخفی تھا کیونکہ وہ کرسی مخالف سمت میں گھما کر بیٹھا ہوا تھا۔

سلمان رضا گیلانی کے وجود کا جائزہ لینے پر مشعل نے اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑی سگریٹ کو دیکھا تو اس کا چہرہ دہک کر انگارہ ہونے لگا۔ اس کے اس ری ایکشن سے صاف واضح تھا کہ اسے سگریٹ نوشی سے کس قدر نفرت ہے۔

مشعل نے اپنا غصہ ضبط کرنے کے لیے ایک گہرا سانس لیا پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ یونہی کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے کا منظر اس کی سمجھ سے بالاتر اور اشتعال انگیز تھا۔ کمرے میں بے ترتیب پڑے کاغذات اور کتابوں کے درمیان سلمان رضا گیلانی نے ایک اور سگریٹ سلگائی۔ بارش کی بوندوں کی آواز دھوئیں کی مہک کے ساتھ مل کر ایک عجیب سا رونا رو رہی تھی۔ کمرے میں سفید دھواں ایک گہرا سمندر بن چکا تھا، جیسے کوئی اجالا اپنی ہی آغوش میں گم ہو رہا ہو۔ سلمان رضا گیلانی، ہر سانس کے ساتھ اپنی بے چینی کو دھوئیں کے دائرے میں تحلیل کرتے ہوئے، ایک کے بعد ایک سگریٹ کو آگ کی نذر کر رہا تھا۔ سگریٹوں کی لکیر سیاہ آسمان پر ایک المیہ نغمہ گاتی تھی۔ پانچویں سگریٹ کی آخری کش نے کمرے کو ایک دھندلے سے پردے میں چھپا دیا، جیسے کوئی راز دار اپنی کہانی کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہو۔ اسی اثنا میں، دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز نے اس کی

توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ مشعل کے قدموں کی چاپ کو کاشان کی آمد سمجھتے سلمان کے خشک لبوں پر ایک مکارانہ مسکراہٹ کھل اٹھی، جیسے کوئی زہر آلود تیر اپنے نشانے کی جانب بڑھ رہا ہو۔ کرسی کے ہتھے کو اپنی انگلیوں میں جکڑے ہوئے، وہ ایک لمحے کے لیے سکتے میں آ گیا، گویا کوئی نامعلوم ساز اس کے دل پر کوئی الم نغمہ بجا رہا ہو۔

اس غیر متوقع صورت حال پر مشعل دروازے میں کھڑی اس منظر کو دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ پھر آگ بگولہ ہو کر وہ اس کی سمت بڑھتی ہوئی، بڑی سی میز کے پاس پہنچ کر رکی۔ اب وہ شش و پنج میں مبتلا تھی، کرسی کی پشت کو گھورتی رہی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

دوسری طرف سلمان رضا جو خود کو کسی کی کڑی نظروں کے حصار میں محسوس کرتا ہوا کرسی گھما کر یونہی اس کی جانب مڑا، مشعل نے میز پر موجود پانی سے بھرا گلاس اٹھایا اور قدرے بے باکی سے اس پر انڈیل دیا۔

مشعل کے اچانک حملہ آور ہونے پر غیظ و غضب کی ایک شدید لہر سلمان رضا کے وجود میں دوڑی تو غصے سے تلملاتے، لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس نے اپنی پسٹل نکالی اور مشعل کے ماتھے پر رکھتے جارحانہ انداز میں اس کا بازو دبوچتے ہوئے اسے اپنی جانب کھینچا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے دیوار سے لگا دیا۔ جس سے دوپٹہ اس کے سر سے سرک کر اس کے شانوں پر رہ گیا۔ اور اس دوران ہیبت و جلالت سے کانپتے ہوئے مشعل کے ہاتھوں سے گلاس بھی چھوٹ کر زمین بوس ہوا تھا اور نجانے کتنی ہی کرچیوں میں بٹ کر رہ گیا۔

سلمان کے مضبوط ہاتھوں کی سخت گرفت میں وہ معصوم سی ڈری سہمی کھڑی لڑکی کا دل اب کسی ننھے پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ مشعل کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو دیکھ رہی ہے وہ حقیقت ہے۔ دوسری طرف سلمان رضا گیلانی کچھ سمے کے لیے مشعل مہتاب کی گہری، سیاہ، اور دلکش آنکھوں میں

گرفتار سا ہوا، اپنی صدیوں کی تھکان، تمام درد، اور خواہشات کو ان آنکھوں میں ڈھلتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی روح مشعل کی آنکھوں میں اتر گئی تھی، اور وہ اپنے آپ کو ان آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ اپنی پہچان کو ان آنکھوں میں پا رہا تھا۔ سلمان کی نظریں مشعل کی آنکھوں سے چپک سی گئی تھیں، جیسے وہ کوئی راز تلاش کر رہا ہو۔ اور اسی لمحے، دونوں کا دل ایک دوسرے کو تلاش کر رہا تھا، جیسے دو آئینے ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی تصویر کو تلاش کر رہے ہوں۔

کچھ لمحے خاموشی کی نذر کرنے کے بعد، بمشکل ہمت سے اپنی گھنی و لمبی پلکیں جھپکا کر مشعل نے سامنے کھڑے شخص کی گہری نگاہوں میں جھانکتے ہی فوراً نظریں چرا لیں۔ اس کی نظر میں وہ شخص کتنا بدلا ہوا تھا! وہ شخص واقعی میں اس کی زندگی کی کہانی کا ایک نہیں سمجھا جانے والا باب تھا۔ دراز قد، ورزشی جسم، کالے گھنے بال، ڈارک براؤن آنکھیں، مغرور سا ناک، سرخ سفید رنگت کا حامل۔۔ وہ شخص ظاہری شکل سے تو کسی ریاست کا شہزادہ لگ رہا تھا۔ لیکن پہلی نظر دیکھنے میں اس کی اداس آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ اندر سے بالکل خالی، لوٹا اور ٹوٹا ہوا شخص کتنا بے مایہ ہے۔ یا شاید صرف وہی جانتی تھی کیونکہ وہی واحد ایک تھی جو اس آنکھوں میں چھپے راز کو پڑھ سکتی تھی۔

...

دروازے پر دستک دیے بغیر وہ اندر داخل ہوا تو نظروں کے سامنے دل دہلا دینے والا منظر دیکھ کر وہ چونک گیا۔ کمرے میں ایک ایسا سناٹا تھا جیسے کوئی قبرستان ہو۔ جہاں صرف وقت کا سوزناک نغمہ سنائی دے رہا تھا۔ دھندلی سی روشنی میں سلمان کا سایہ دیوار پر ایک ڈراؤنے عفریت کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ مشعل کی آنکھیں بے بسی سے ایسے پھیلی

تھیں، جیسے وہ سمندر میں ڈوبنے والی ایک کشتی ہو۔ اس کا ہاتھ بے بس ہو کر ہوا میں لٹکا ہوا تھا۔ سلمان کا چہرہ ایک ماسک کی طرح تھا، جس کے پیچھے کیا چھپا ہوا تھا، کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں دو شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کمرے میں بکھری ہوئی کتابیں اور کاغذات ایک ایسا منظر پیش کر رہے تھے، جیسے کوئی طوفان آیا ہو۔

مشعل سفید لباس میں ملبوس تھی، جو اس کی بے بسی کو اور بھی اجاگر کر رہا تھا۔ دروازے پر کھڑا شخص کمرے کا منظر ایک مختلف زاویے سے دیکھ رہا تھا، جیسے کوئی تماشائی ہو۔

جبکہ کمرے میں کسی تیسرے کی موجودگی سے بیگانہ سلمان رضا گیلانی، مشعل مہتاب پر ابھی بھی ویسے ہی ریوالور تانے کھڑا تھا جیسے کوئی بے جان گڑیا، کسی بچے کے ہاتھ میں اسیر ہو۔ سلمان کا ہاتھ ریوالور پر اتنا مضبوطی سے جما ہوا تھا کہ اس کی انگلیاں سفید پڑ چکی تھیں اور رگیں اتنی ابھر آئی تھیں جیسے کسی شکاری کے پنجے میں تڑپتا ہوا شکار ہو۔

اب مشعل کی ڈری اور سہمی سہمی نگاہوں کے تعاقب میں دروازے پر کھڑے شخص کو دیکھتے ہی سلمان کی آنکھیں حیرانگی سے پھیلتی ہوئی قہر آلود ہوئیں۔

مشعل کے لبوں پر اس کا نام پھڑ پھڑایا:

"پروفیسر ہمدان۔۔۔۔"

بے یقینی و حیرانگی کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے ہمدان صاحب نے کچھ قدم اٹھا کر کیبنٹ روم میں بنی بڑی سی گلاس ونڈو کے درمیان آکر ٹھہرتے سرسراتی آواز میں جیسے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی تمہید بندھتی اس سے پہلے سلمان گیلانی نے ریوالور مشعل پر سے ہٹا کر اس پر تان لیا۔ مشعل سے اب اپنے قدموں پر کھڑے ہونا قدرے مشکل تھا۔

دوسری سمت ہمدان صاحب کے حلق میں گلٹی سی ابھری، تبھی سلمان گیلانی نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو ریوالور کی جانب زور دیتے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلنے سے پیدا ہونے والا شور اطراف میں پھیلے ہوئے سناٹے میں

سرایت کرتا وہاں موجود ہر ایک کو اپنی جگہ پتھر کا کر گیا۔ جبکہ گولی پروفیسر ہمدان کے وجود کے بالکل قریب سے گزرتی ہوئی کانچ کی پانچ گیندوں میں سے جا کر سب سے پہلی کو پھوڑتے کھڑکی کے موٹے شیشے کو چیر کر اس میں چھید کر گئی تھی۔

گنگ ہوتے ہوئے ہمدان صاحب نے آہستگی سے گردن ذرا پیچھے کی سمت موڑتے ہوئے ترچھی نگاہوں سے گلاس ونڈو میں لگی گولی کا معائنہ کرنا چاہا تھا کہ سلمان کے کئی فائر پے در پے کرنے پر وہ بے انتہا دہشت و ہیبت کی لپیٹ میں آتا دل تھام کر ہانپتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ جبکہ سلمان کے ریوالور سے چلنے والی گولیاں پانچوں گیندوں کو باری باری پھوڑ کر شیشے کی کھڑکی میں سوراخ کر کے اس کے پکے نشانے باز ہونے کی گواہی چیخ چیخ کر دے رہی تھیں۔

کاشان فون کان سے لگائے کسی سے بات کرتا ہوا آفس میں داخل ہوا تو وہاں موجود ہر کوئی فق چہرے کے ساتھ ڈر سہا کھڑا تھا۔

سلمان رضا گیلانی نے خائف ہوئے پروفیسر ہمدان پر سے اپنی غصیلی نظریں ہٹا کر، کانوں میں ہاتھ رکھے بمشکل اپنے پیروں پر کھڑی مشعل کی جانب مڑ کر دیکھا تو وہ خوف سے تھرتھراتی ہوئی تیز تیز سانسیں ایسے لے رہی تھی جیسے اس کی جان اس کے پورے بدن سے نکل کر اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہو۔ نیلے ہونٹ، چہرے کی پیلاہٹ اور آنکھوں میں بے تحاشا خوف کے ساتھ ماتھے پر آئی پسینے کی ننھی بوندیں مشعل مہتاب کے دہشت سے مرعوب ہونے کی نمائندگی کر رہی تھیں۔

سلمان رضا گیلانی کے دبدبے میں آئی لڑکی کی ہمت اب ٹوٹ گئی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا، جیسے اس کی زندگی کی روشنی بجھ گئی تھی۔ وہ کمزور ہو کر گرنے لگی، جیسے کوئی سوکھا پتا شاخ سے ٹوٹ کر گر رہا ہوتا ہے، اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ سلمان گیلانی نے اپنی قوت کا اظہار کرتے ہوئے بدقت کرسی کو زور سے ٹانگ مار

کر اس کی جانب دھکیلا۔ کرسی پر گرتے ہی مشعل بے سود ہو گئی تھی، اس کی سانسیں مدھم ہو گئی تھیں، اور اس کا بدن کمزور ہو کر کرسی پر پڑا تھا۔

~~~~~~~

کمرے میں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ بیڈ پر چت لیٹی سو رہی تھی یا شاید ابھی تک بیہوش تھی۔ غنودگی کی حالت میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ بے چینی سے بیڈ پر ہاتھ مار رہی تھی۔ اور کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی، الفاظ واضح نہ تھے۔ یکدم وہ "آپی" کہہ کر اٹھ بیٹھی۔

ماضی

مشعل نے دروازہ کھولا اور اندر آئی۔ زرمین ابھی تک سو رہی تھی۔ مشعل نے اپنا کندھے پر پہنا بھاری بستہ صوفے پر پھینک کر بیڈ پر پڑے آڑے ترچھے وجود کی طرف دوڑ لگائی اور قریب پہنچتے ہی اس کا لحاف کھینچا اور کم آواز میں اسے پکارا۔ اس قدر کم آواز میں کہ باہر کوئی سن نہ لے مگر اس چکر میں آواز کی رسائی زرمین کے کانوں تک ہی ناممکن رہی۔

مشعل نے دوبارہ ذرا سی اونچی آواز میں اسے جگانے کی کوشش کی:

"آپی۔۔۔۔۔۔"

لیکن زرمین نے کوئی رد عمل نہیں دکھایا۔

مشعل نے مزید تیز آواز میں بلایا:

"آپیی۔۔۔۔"

زرمین نے نیم وا آنکھوں کے سامنے مشعل کا چہرہ لہرایا تو خمار آلود آواز میں عاجزی سے کہہ کر کروٹ بدلی:
~~~~~~~

"آآآآں۔۔۔۔۔سونے دو مشعی۔۔۔کیا کر رہی ہو۔"

اب کی بار مشعل نے اسے کندھوں سے پکڑ کر زور سے ہلایا اور دانت بھینچتے ہوئے غصیلی آواز میں کہا:

"آپی، اٹھ جائیں، ابو جان پہلے ہی امی سے آپ کا پوچھ رہے ہیں کہ ابھی تک اٹھی ہے یا نہیں۔"

زرمین نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں اور مشعل کو دیکھا۔ اس نے سست آواز میں پوچھا:

"کیا ہوا؟"

مشعل نے ضبط کا گھونٹ حلق کے نیچے اتار کر ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے دوبارہ کہا:

"آپی، ابو جان پہلے ہی امی سے آپ کا پوچھ رہے ہیں کہ ابھی تک اٹھی ہے یا نہیں۔"

زرمین کی آنکھیں خوف و خطر سے کھلنے کی بجائے پھٹ سی گئیں اور جسم میں ایسا کرنٹ لگا جس نے ایک جھٹکے میں اسے اٹھا کر بیٹھتے ہوئے بے ساختہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا:

"کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟؟؟؟ابو جی گھر آ گئے؟"

مشعل نے اپنے وجود کا جائزہ لیتے عادتاً طنزیہ و مزاحیہ انداز میں سوال کے بدلے سوال کیا:

"میرے سامنے کھڑے ہونے پر آپ کو کوئی شک ہے؟؟؟یا۔۔۔آپ ہماری تشریف آوری کا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہیں۔۔۔آپ ابھی تک؟؟؟"

زرمین نے کھا جانے والی نظروں سے مشعل کو گھورتے ہوئے ناشائستگی سے کہا:

"میں پوچھ رہی ہوں ابو گھر آ گئے اور تم کیا بکواس کر رہی ہو ہاں۔۔۔؟؟"

مشعل نے ہتھیار ڈالتے ہوئے رسانیت سے بتایا:

"ظاہر ہے آپی میں کالج سے ان کے ساتھ ہی گھر آتی ہوں تو مطلب وہ آ چکے ہیں اور امی

سے آپ کا پوچھ بھی رہے ہیں۔"

مشعل نے اپنی بڑی بہن کا بد تمیز رد عمل دیکھا اور وہ خاموش ہو گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس نے اپنی بڑی بہن کو جگانے کی کوشش کی تھی تاکہ اسے نماز کی دیر نہ ہو، لیکن اب وہ بد تمیزی کا شکار ہوئی تھی۔

زرمین نے پوچھا:

"امی نے کیا کہا پھر ۔۔۔۔۔؟؟؟"

اس دفعہ جواب دروازے میں کھڑی ناہید بیگم نے دیا:

"یہی کہ نماز پڑھ رہی ہے۔ اٹھو جاؤ اب۔۔ اور اٹھ کر نماز پڑھو۔۔"

شرمندگی سے نگاہیں جھکاتی، اٹھاتی، کبھی پھیرتی اور انگلیوں کو مختلف زاویوں میں مروڑتی زرمین کو سرد نگاہوں کے حصار میں لیے ناہید بیگم نے تنفر و برہمی سے کہا تو اتنی عزت افزائی ہو جانے کے بعد زرمین نے اپنا سامنہ لے کر بستر سے پاؤں نیچے رکھے تو ایک چپل تھی، دوسری نہیں تھی، پہلے دائیں پھر بائیں دیکھتے ہوئے اس کے سماعتوں میں مشعل کی کھی کھی مطلب خصوصاً ناگوار ہنسی نے زہر گھولنے کا کام کیا۔

غصے کو ضبط کر کے اس نے متلاشی نظروں سے بیڈ کے نیچے دیکھا تو دوسرا چپل بر آمد ہوا، جو نٹ کھٹ کہیں کا شاید اس سے چھپن چھپائی کھیل رہا تھا۔ جلدی میں وہ چپل پہن کر اٹھی تو اس کے پاؤں چپل میں جیسے پھنس سے گئے تھے، شاید چپل چھوٹا تھا یا اس کا نہیں تھا۔ دو تین قدم چلنے کے بعد مشعل کے فلک شگاف قہقہے نے اس کے آگے بڑھتے قدم ایک جگہ منجمد کر دیے۔

مڑ کر وہ مشعل کو گھوری سے نوازتی اس سے قبل اس کی نظریں ناہید بیگم کے سپاٹ چہرے پر ٹھہریں۔ سر کو ہلکی جنبش دیتے کچھ کہنے کے لیے اس نے لب ہلائے ہی تھے کہ ایکا ایکی اس کی نگاہ اپنے پیروں میں الٹے پہنے ہوئے چپل پر پڑی، لمحے کو زرمین کے ذہن

میں بچپن کی یاد تازہ ہو گئی۔ وہ لڑکھڑا کر چلتی تھی اور اپنے چپل الٹے پہنتی تھی۔ وہ اب تک بچپن کی وادیوں میں گم رہنا چاہتی تھی مگر ابو امی کا ڈر اس قدر تھا کہ وہ چپل سیدھے کیے بغیر باوضو ہونے کی غرض سے واش روم میں گھس گئی تھی۔

زرمین کی بے پرواہی اور معصومیت پر ناہید بیگم کے چہرے کے پتھریلے تاثرات پگھل گئے اور لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ جانتی تھیں کہ زرمین ابھی بھی بچپن کی وادیوں میں گم ہے۔

ناہید بیگم نے مشعل کی توجہ اپنی جانب مبذول کر کے نزاکت و ملائمت سے نماز پڑھنے کے لیے کہا:

"ٹھیک ہے امی"!

مشعل نے مؤدب ہو کر کہا تو ناہید بیگم نے بولا کہ وہ ان کے ابو سے کھانے کا پوچھ لے کہ وہ ابھی کھائیں گے یا ذرا ٹھہر کر تم لوگوں کے ساتھ ہی کھائیں گے۔

اتنے میں زرمین باوضو ہو کر واش روم سے نکلی، اسی آن ناہید بیگم اور مشعل کی نگاہ اس کے پیروں پر گئی تو زرمین نے چپل سیدھے پہنے ہوئے تھے۔

تینوں ماں بیٹیوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا:

"ہاہاہا"!

اور اس خوبصورت لمحے کو جو ان کے درمیان محبت اور خوشی کا اظہار کر رہا تھا یادوں کے خزانے میں قید کر لیا۔ زرمین کی یہ حرکت ان تینوں ماں بیٹیوں کے لیے ایک خوشگوار لمحہ تھا، جسے وہ کبھی بھول نہیں سکتیں۔

~~~~~~
~~~~~~

مشعل بیہوشی سے اپنی بہن (زرمین) کا نام لے کر اٹھی تھی اور کافی دیر خاموش بیٹھی ناہید بیگم کو تکتی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی خاموشی تھی۔

ناہید بیگم نے مشعل کو اپنے ساتھ لگا کر محبت و شفقت سے پوچھا:

"کیا ہوا ہے، میری بیٹی؟"

مشعل پہلے کی طرح اب بھی خاموش رہی، پھر بے آواز روتے ہوئے بولی:

"امی زری آپی"...

آنسوؤں کا گولا اس کے حلق میں پھنس گیا اور وہ روتے روتے چپ ہوئی اور مہتاب صاحب کو دیکھنے لگی۔

زرمین کا نام سن کر ناہید بیگم کے چہرے پر ایک دکھی سی لکیر ابھری۔

مہتاب صاحب نے اپنی آواز میں دباؤ رکھ کر قدرے ناچاری و درماندگی سے کہا:

"زرمین کو بھول جاؤ، وہ ہمارے لیے صرف ایک تلخ یاد ہے۔"

ناہید بیگم نے بے بس ہو کر ذرا سرد لہجے میں کہا:

"خود آپ سے تو ہوا نہیں کہ اسے بھول جائیں۔ اور ہمیں بھول جانے کا کہہ رہے ہیں؟"

مشعل نے اپنے والدین کو آنسوؤں سے لبالب آنکھوں سے دیکھا اور دھیمی آواز میں کہا:

"میں انہیں کیسے بھول سکتی ہوں وہ میری بہن تھی اور آپ کی بیٹی۔"

جب مشعل نے زرمین کا تعلق یاد دلایا، تو کمرے میں ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ لیمپ کی ہلکی روشنی کے سوا، ہر چیز غم کے سائے میں ڈوب گئی۔ اور بس، نیم اندھیرا رہ گیا۔

~~~~~~

رات کا دوسرا پہر تھا، چاندنی رات کے سناٹے میں گھر کی دیواروں پر سائے بن رہے
~~~~~~

تھے۔ پورے گھر میں صرف ایک کمرے کی بتی روشن تھی، جس سے سلمان رضا گیلانی کے کمرے کی خاموشی میں ایک مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی میں کھڑا، غمزدہ اور ملال میں ڈوبا ہوا تھا۔

سلمان نے اپنے دل سے پوچھا:

"کیوں میں اب بھی اس یاد کر کے افسردہ ہو رہا ہوں؟ کیا میں اب بھی اُس سے محبت کرتا ہوں؟"

اس کے سوچنے کی لہر بہت کمزور تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں ملال کی گہرائی واضح تھی۔

اس نے آہستگی سے آنکھیں بند کر کے دل و دماغ سے ساری سوچوں اور یادوں کو جھٹکنا چاہا مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ کیونکہ سلمان کے دل میں ایک دردناک خلا تھا، جسے وہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود بھی بھر نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی چھوڑی ہوئی محبت کی یادوں میں کھو گیا تھا، اور اسے یہ سمجھنے میں مشکل تھی کہ وہ اب کیا کرے۔

"کیا میں اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں؟" یہ سوال سلمان کے دل میں ابھی تک گھوم رہا تھا، جس کا اسے کوئی جواب نظر نہیں آ رہا تھا۔

سلمان نے اب آنکھیں کھولیں اور مضمحل قدموں سے اٹھتا ہوا بیڈ کی سمت بڑھ آیا۔

~~~~~~~

راحیلہ بیگم اور سلمان ڈائننگ روم میں ناشتہ کر رہے تھے۔ جہاں سورج کی روشنی کی کرنوں کی سنہری چمک سلمان کے چہرے پر پڑ رہی تھی، اور اس کے ساتھ ہی ایک
~~~~~~~

نازک سازر درنگ کا سایہ بن کر اس کی متورم آنکھوں میں چھپے درد کو واضح کر رہا تھا۔ جو کہ اس کی پوری شخصیت پر گہرا اثر انداز تھا۔

راحیلہ بیگم نے قدرے سنجیدگی سے کہتے ہوئے سلمان کے چہرے کو گہری توجہ سے دیکھا:

"بیٹا، ہمیں مشعل کی طبیعت پوچھنے جانا چاہیے، وہ بخار میں ہے۔"

سلمان کچھ توقف کے بعد ذرا سوچ کر گمبھیر آواز میں بولا:

"نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔"

راحیلہ بیگم نے شائستگی و سنجیدگی سے کہا:

"بیٹا، تمہیں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ مشعل ہمیشہ سے تمہارے لیے بہت اہم ہوا کرتی تھی۔"

سلمان نے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا:

"جی امی، مشعل میرے لیے اب بھی بہت اہم ہے، لیکن میں اس کے لیے اس گھر نہیں جانا چاہتا، جہاں میرے لیے اب بھی بہت ساری یادوں کا بوجھ ہے۔"

اب کی بار سلمان نے اپنا سر جھکا کر، چائے کے کپ کے کنارے پر اپنی انگلی پھیرتے ہوئے، قدرے غمگین اور مدہم آواز میں کہا:

"بیٹا، وہ تمہارے ماموں کا گھر ہے۔"

راحیلہ بیگم نے سلمان کے ہاتھ کو تھام کر پر خلوص لہجے میں جیسے یاد کروایا۔

سلمان نے کہا:

"جی امی، میں جانتا ہوں وہ میرے ماموں کا گھر ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اسی گھر سے ماموں نے مجھے نکل جانے کا کہا تھا۔"

یہ کہتے ہی سلمان کا حلق کڑوا ہو گیا اور چہرے پر اداسی چھا گئی۔

راحیلہ بیگم نے متاسف ہو کر کہا:

"بیٹا، وہ تمہاری ہی غلطی پر بولا تھا۔ کاش تم بتا دو تم نے ایسا کیوں کیا تھا تو آج رشتوں کے درمیان آئی یہ دوریاں ختم ہو جائیں۔"

سلمان نے کہا:

"اس وقت جو مجھے صحیح لگا میں نے وہی کیا، مگر ماموں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، امی میرے دل پر لگا اب بھی وہ زخم تازہ ہے جو ماموں نے مجھے دیا تھا۔"

یہ کہتے ہی سلمان کی آنکھیں نمکین پانیوں سے لبالب بھر آئیں۔

راحیلہ بیگم نے کہا:

"بیٹا، گزری ہوئی باتوں کو بھول جاؤ، اور اپنے ماموں کی محبت اور شفقت کو یاد رکھو۔ وہ تمہارے لیے ہمیشہ اپنا دل کھول کر رکھتے تھے، اور اب بھی رکھتے ہیں۔ آج بھی وہ تمہیں اپنا بیٹا سمجھتے ہیں۔"

راحیلہ بیگم کے الفاظ سلمان کے دل پر گہرا اثر ڈال رہے تھے اور اسے اپنے ماموں کے ساتھ اپنے رشتے کو از سر نو سجانے کی طرف مائل کر رہے تھے۔ اب سلمان خاموش تھا، اور اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔ یہ شاید راحیلہ بیگم کے فکر مندانہ لہجے میں قدرے نرمی و ملائمت سے سمجھانے کا نتیجہ تھا۔

..☆☆☆..

مشعل نے مہتاب صاحب کے فون سے مینجر کاشان کو کال کی، دوسری گھنٹی پر کال ریسیو ہوتے ہی مشعل نے سلامتی بھیجنے میں پہل کی:

"السلام و علیکم۔"

کاشان نے بھی پر خلوص لہجے میں سلام کا جواب دیا:

"وعلیکم اسلام، مشعل بیٹا، سب خیریت؟"

مشعل نے بے ساختہ اور پر اعتماد لہجے میں کہا:

"جی کاشان بھائی، مجھے کل کے سارے واقعے کی سی سی ٹی وی فوٹیج چاہیے۔"

یہ سنتے ہی کاشان کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئیں جبکہ حیرانگی سے آنکھیں پھیل کر بڑی ہو گئیں۔

کاشان نے مضطربانہ انداز میں مؤدب ہو کر بتایا، جیسے کہ اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو:

"مشعل بیٹا، یہ فوٹیج... یہ تو سلمان رضا گیلانی نے کل ہی ڈیلیٹ کروادی ہے۔"

مشعل کا دل دھڑک اٹھا، جب کاشان نے اپنی آواز میں خوف و ہیبت کا عنصر شامل کرتے ہوئے کہا:

"مجھے ڈر ہے کہ سلمان رضا کو پتہ چل جائے گا کہ میں نے آپ کو فوٹیج کے بارے میں بتایا ہے۔ سلمان رضا گیلانی نے ہمیں سختی سے منع کیا ہے کہ اس بات کا باہر کسی کو کوئی علم نہ ہو، خاص کر سر مہتاب کو۔"

کیا آپ اس میں مزید کوئی تبدیلی چاہتی ہیں؟

~~~~~~~

سلمان رضا گیلانی کی شاندار شخصیت گاڑی سے اترتے ہی ظاہر ہو گئی، اس کے چہرے کی گہری لکیریں اور اس کے بالوں کی منظم ترتیب اسے ایک شاندار اور طاقتور آدمی کے روپ میں پیش کر رہی تھی۔ اس نے گاڑی سے اترتے ہی اپنے خاص انداز میں قدم رکھا، اس کے نوک دار جوتے کی چمک مہتاب میر کے دروازے پر پڑی۔ اس نے اپنے
~~~~~~~

کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے گاڑی کا دوسری جانب کا دروازہ کھولا اور راحیلہ بیگم کو ہاتھ پکڑ کر باہر نکالا۔ اس کی اداس آنکھوں میں ایک گہری چمک تھی، جو اس کے ماضی کی یادوں کو چھپا رہی تھی۔ جب اس نے اپنی آنکھوں سے سیاہ گلاسز کا پہرہ اتار کر عمارت کو دیکھا، تو اس کے دل میں ایک تجسس کھلنے لگا، جیسے کہ وہ اپنے ماضی کی ایک ایک یاد کو تازہ کر رہا تھا۔

جیسے ہی سی سی ٹی وی فوٹیج "ڈیلیٹ فور ایوری ون" ہوئی، مشعل کے ذہن میں وہ خوفناک منظر تازہ ہو گیا۔ وہ شخص جس نے فوٹیج میں اس کے ماتھے پر پسٹل تانی ہوئی تھی، اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ وہ شخص جسے وہ بھولنا چاہتی تھی، وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

مشعل نے اپنی سانسوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ تیز تیز ہو رہی تھیں۔

اس نے اپنے دل کی دھڑکن کو تھامنے کی کوشش کی، لیکن وہ تیز تیز دھڑکتا جا رہا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا:

"یہ صرف ایک خواب ہے، یہ صرف ایک خواب ہے۔"

لیکن وہ شخص جو اس کے سامنے تھا، وہ اتنا حقیقی لگ رہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اللہ سے دعا کی کہ اگر وہ حقیقت میں واقعی اس کے سامنے ہے تو وہ چلا جائے۔ اور جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں، تو وہ شخص غائب تھا۔ وہ چاروں طرف دیکھتی رہی، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا:

"یہ صرف ایک خواب تھا۔"

لیکن اس کا دل اب بھی تیز تیز دھڑکتا جا رہا تھا، اور اس کی سانسوں میں اب بھی خوف کی بو تھی۔

مشعل کی بند آنکھیں ناہید بیگم کی آواز پر کھل گئیں:

"مشعل... مشعل بیٹا، تمہاری پھوپھو"...

ناہید بیگم کمرے میں داخل ہوئیں، تو ان کی آواز بیڈ پر جھلمل جھلمل کرتے غباروں کو دیکھ کر رک گئی۔ وہ منظر بہت عجیب تھا، جیسے کہیں سے ایک رنگین دنیا اس کمرے میں اتر آئی ہو۔

مشعل نے پلٹ کر ناہید بیگم کی طرف دیکھا، اور پھر ان کی نظروں کے تعاقب میں بیڈ پر دیکھا۔ وہ حیران و پریشان رہ گئی، جیسے اس کا دل ان غباروں کی خوشبو سے بھر گیا تھا۔

ناہید بیگم نے جوش و خروش سے بھرپور لہجے میں مسکرا کر کہا:

"میں نے تو تیمارداری کے لیے بہت سوں کو پھل اور پھول لاتے دیکھا ہے لیکن یہ لولی پاپ اور بلونز۔۔۔ پہلی دفعہ کسی کو لاتے دیکھ رہی ہوں۔"

مشعل کی آنکھوں کی پتلیاں غباروں پر سے ہٹنے سے انکاری تھیں، جیسے وہ اس کی خوشی کو اپنے دل میں بسا لینا چاہتی تھی۔

ناہید بیگم کا چہرہ مسکراہٹ سے چمک رہا تھا:

"ماننا پڑے گا سلمان کو بہت اچھے سے جانتا ہے کہ تم کس چیز سے خوش ہو گی۔"

ان کی آواز میں ایک خفیف سا لہجہ تھا، جو مشعل کی خوشی کو سمجھنے اور خاموشی کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

...

مشعل نے ناہید بیگم کی سمت رخ موڑ کر ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنی چاہی:

"امی، ابو کا فون ہے، ان کی اجازت سے میں نے کاشان بھائی کو کال کی تھی۔"

ناہید بیگم نے متحیر و متفکر ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"کاشان کو فون، خیر سے کیا تھا؟"

مشعل نے اپنی بات جاری رکھی:

"جی امی، کل ابو میڈیسن کھائے بغیر آفس چلے گئے تھے ناں اور اپنا انہیلر بھی گھر بھول گئے تھے۔ میں انہیں آفس میں انہیلر دینے گئی تھی، لیکن وہ بزنس ڈیل کے لیے پروجیکٹ سائٹ پر گئے تھے، جہاں ان کی میٹنگ تھی اور پھر میری طبیعت خراب ہے یہ سن کر ابو وہاں سے سیدھا گھر آ گئے تھے۔ اس لیے میں نے کاشان بھائی کو فون کیا ہے کہ وہ رائڈر کے ہاتھ ابو کی میڈیسن اور انہیلر گھر بھجوا دیں۔"

ناہید بیگم نے اس کے ہاتھ سے فون تھامتے ہوئے تفاخرانہ لہجے میں کہا:

"بہت اچھا کیا بیٹا، تم اپنے ابو کی دیکھ بھال کا فرض پوری طرح اچھے سے نبھا رہی ہو ورنہ مجھے تو یہ یاد نہیں رہتا کہ تمہارے ابو نے دوائی لی بھی یا نہیں لی۔"

ان کی بات سن کر مشعل سادگی سے مسکرائی۔

ناہید بیگم نے کہا:

"بیٹا، باہر تمہاری پھوپھو تمہاری خیریت پوچھنے کے لیے آئی ہیں، سلمان بھی آیا ہے، باہر آ کر مل لو۔"

مشعل نے رسانیت سے کہا:

"ٹھیک ہے امی، آپ چلیں میں آتی ہوں تھوڑی دیر تک۔"

..☆☆☆..

مہتاب صاحب کی آنکھوں میں ایک گہری چمک اٹھی، جب انہوں نے اپنی بہن سے ملاقات کی۔ لیکن جب سلمان ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا، تو یکلخت ان کی نگاہ اس پر جا کر

ٹھہری۔ وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، اب جیسے ان کی ٹانگوں میں زور نہیں رہ تھا۔ ان کی آنکھیں حیرت اور تعجب سے چمکنے لگیں، جبکہ سلمان کی نگاہیں بھی مہتاب صاحب کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

مہتاب صاحب کے چہرے پر ماضی کا درد اُکھڑی جھریوں میں کہیں مخفی تھا، جہاں درد کی لہریں ان کی آنکھوں میں ایک گہرا روحی زخم چھوڑ گئی تھیں۔ لیکن ان کی آنکھوں میں ابھی بھی کہیں ایک روشن چمک باقی تھی۔ سلمان کی موجودگی نے ان کے دل میں ایک گہرا اثر کیا تھا، جیسے وہ ماضی کے درد کو دوبارہ محسوس کر رہے تھے۔ جب سلمان نے زرمین سے منگنی توڑنے کا اعلان کیا تھا، تو مہتاب صاحب نے اس کے چہرے پر ایک تھپڑ سب کے سامنے جڑ دیا تھا۔ وہ لمحہ ان کی یادوں میں آج بھی تازہ تھا، اب دونوں کی آنکھوں میں ایک گہرا درد نمی بن کر چمک رہا تھا۔

سلمان کی موجودگی نے مہتاب صاحب کے دل میں ایک تیز بھوکھر اٹھادی تھی، جیسے وہ اپنے ماضی کے درد کو دوبارہ جی رہے تھے، اور ان کی سانسوں میں ایک گہرا غم اٹھ رہا تھا۔ ان کی آنکھیں سلمان کی طرف دیکھ رہی تھیں، جیسے وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے، کچھ جواب چاہتے تھے جو ان کے ماضی کے درد کو کم کر سکتے۔ لیکن سلمان چپ تھا، اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، جیسے وہ اپنے ماضی کی خطاؤں کا اعتراف کر رہا تھا، اور اپنے دل کی گہرائیوں سے عمیق اور ناقابل بیان درد اٹھتا ہوا محسوس رہا تھا۔

~~~~~~~

جب مشعل کمرے سے باہر نکلی تو اس کی آنکھیں نم تھی۔ شاید سلمان کے ساتھ ہوئے
~~~~~~~

منظر کے اثرات سے وہ ابھی تک متاثر تھی۔

وہ اپنی پھوپھو کے قریب پہنچی اور انہیں اسلام کیا۔ راحیلہ بیگم نے اُسکے گلے لگا کر اس کے صبیح چہرے پر ہاتھ پھیرا اور فکر مندانہ لہجے میں کہا۔ ابھی بھی بخار ہے!! خیر ہے پھوپھو یہ تو کم زیادہ ہوتا ہی رہتا ہے، آپ بتائیں کیسی ہیں؟؟ مشعل نے رسانیت سے پوچھا۔

ناہید بیگم کے دل میں ایک رنجیدہ احساس پیدا ہوا، جب انہوں نے مشعل کا اپنی پھوپھو کو قدرے گرم جوشی سے ملنا دیکھا۔ انکی یادوں میں زرمین کی تصویر اٹھی، جس میں وہ ہمیشہ ناخوش اور مجبور تھی، دل سے خوشی کے ساتھ ملنے کی بجائے زبردستی خود کو رسماً ملنے پر مجبور کرتی تھی۔ مشعل کی گرم جوشی کے سامنے زرمین کی ناخوشی نے اُنکے دل کو ایک بار پھر بجھا دیا۔

)ماضی`` ``(

"شاید پھوپھو لوگ آ گئے," زرمین نے سوچا اور بالوں میں برش پھیر کر باہر آ گئی۔ اس کے سامنے ایک دلکش منظر تھا: مشعل اپنی پھوپھو کے گلے لگ کر کھڑی تھی، اور پھوپھو اسے بڑے پیار سے مل رہی تھی۔

"ارے میری شہزادی! اِدھر آؤ میرے پاس," پھوپھو نے زرمین کو دیکھ کر کہا۔ زرمین پاس پہنچی تو پھوپھو نے اسے بھی اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ اب پھوپھو کی دونوں بانہوں میں یہ بہنیں لپٹی کھڑی تھیں۔

"ماشاءاللہ، میری بچیاں کتنی پیاری ہوتی جا رہی ہیں ناہید!" پھوپھو نے ناہید بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔ زرمین نے محسوس کیا کہ سلمان اسے سامنے سے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا ہے،

اور اس کی آنکھوں میں پیار تھا۔ جسے دیکھ کر اسے بے چینی محسوس ہوئی۔

"اللہ نصیب بھی پیارے کرے," ناہید بیگم نے بے اختیار کہا۔ پھوپھو نے مسکرا کر کہا،

"کیوں نہیں، ان شاء اللہ! میری شہزادیوں کے نصیب آسمان پر تاروں کی طرح جگمگائیں گے۔"

پھوپھو نے پیار سے باری باری دونوں کی پیشانی چومی۔ "آمین۔" ناہید بیگم نے دل سے کہا، اب راحیلہ نے اپنی بانہیں ڈھیلی کیں اور دونوں بہنیں آزاد ہوئیں۔

پھوپھو کا پیار روایتی اور دیہاتی قسم کا تھا۔ زرمین اس پیار کے اظہار سے گھبرائی تھی۔ اب بھی آزادی ملنے پر ایک گہرا سانس لیا تھا۔

ہم سے کوئی سلام دعا نہیں؟؟" سلمان نے کہا، اس کا لہجہ گرم جوشی اور دلچسپی سے لبریز تھا، جبکہ آواز میں محبت و خلوص کی مہک تھی، مگر سامنے والے کی خاموشی میں ایک انوکھی چبھن اور ناشنیدہ پیغام تھا جو اس کی آنکھوں میں چھپا ہوا تھا.

چلے کوئی بات نہیں ہم خود پہل کر لیتے ہیں۔ اسلام و علیکم لٹل پرنسس!! سلمان رضا گیلانی نے بظاہر مشعل پر سلامتی بھیج کر، "پرنسس" کہتے ہوئے اپنی آواز میں زور دیا، اور زرمین کو اپنی گہری نظروں کے حصار میں قید کر لیا۔ سلمان رضا گیلانی کے لفظوں میں چھپا مطلب وہاں موجود ہر کوئی سمجھ گیا تھا۔ اور یہ بھی کہ لٹل کس کو بولا اور پرنسس کس کو بولا گیا ہے۔

وعلیکم السلام!! لٹل سی مشعل نے سلمان کی سمت مسکرا کر دیکھتے ہوئے سلام کا جواب، اس کی آواز میں احترام کی لہر تھی۔ لیکن زرمین کے چہرے پر ایک خفیف سا ادراک اُمڈ رہا تھا، اس کی وجہ سلمان کی نظریں تھیں جو اُسکے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اپنا سر جھکا کر اسے نظر انداز کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں کیونکہ سلمان کی آنکھوں میں چھپی تڑپ اُس کی حالت پر ناگوار گزر رہی تھی اور اس کی کیفیت کو مزید پریشان کر رہی

تھی۔

اب زرمین نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے سلمان رضا گیلانی کو شہزادیوں کیطرح نظر انداز کیا، اور اپنی محتاط مسکراہٹ کے ساتھ، جس میں ایک چھپی ہوئی دلچسپی اور بے نیازی کی ملما تھی، وہ اپنے مخصوص انداز میں چلتی بنی۔

لیکن جاتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی نظر سلمان کے سراپے پر ڈالی، جو براؤن کلر کی شلوار قمیص میں ملبوس، کالی وائسرٹ پہنے ہوئے، براؤن آنکھوں میں دلچسپی لیے اس کی طرف ہی متوجہ تھا۔ لیکن زرمین نے اسے دانستہ نظر انداز کیا اور آگے بڑھ گئی۔

لیکن پیچھے کھڑی ہوئیں مشعل اور ناہید بیگم سے سلمان کی آنکھوں کے بجھتے دیے چھپا نہ سکے۔

~~~~~~~~

کھانے کے بعد، مہتاب صاحب مغرب کی نماز کے لیے اور ناہید بیگم کچن سمیٹنے کے لیے چلی گئیں، جبکہ مشعل بھی ڈائننگ ٹیبل سے دھونے والے برتن اٹھانے لگی۔ راحیلہ بیگم نے مشعل کے ہاتھ سے برتن پکڑتے ہوئے محبت و شفقت سے کہا، "یہ کیا کر رہی ہو بیٹا؟ تم رہنے دو، میں بھابھی کے ساتھ مدد کروا دیتی ہوں۔ تم جا کے آرام کرو، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

راحیلہ بیگم بھی کچن میں ناہید بیگم کی مدد کرنے چلی گئیں۔

وہ مالی استطاعت رکھتے ہوئے بھی گھر میں ملازمین رکھنا اپنے اصولوں کے خلاف سمجھتے تھے، کیونکہ خود انحصاری کی عادت نے انہیں خود کفیل بنا دیا تھا۔
~~~~~~~~

اب مشعل اور سلمان گھر کی سکون بھری فضا میں، دونوں اکیلے رہ گئے تھے۔

....

خود پر سلمان رضا گیلانی کی گہری نظروں کی تپش محسوس کرتے مشعل مہتاب نے اپنے پنکھڑی جیسے گلابی لبوں کو باہم بھینچ لیا اور جب اسنے چہرے پر آئے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے گھنی پلکوں کی باڑ اٹھائی تو مقابل کے مصنوعی چہرے پر بے اختیار ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔

" لٹل۔۔۔" تمہیں بلونز اچھے لگے ؟؟" اسکے سوال پر جواباً وہ خاموش رہی۔ مشعل کی چپی پر سلمان رضا گیلانی کے عنابی لبوں پر بکھری مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

"لٹل برڈ۔۔۔" میں نے کچھ پوچھا ہے۔ سلمان کی آنکھیں میں شرارت ہنوز تیر رہی تھی۔

لٹل اس میٹھے لفظ میں وہی پرانا پیار اور محبت آج بھی تھی۔ وہ آج بھی اس کا وہی پرانا گارڈین اینجل تھا۔ جو اب بھی اُسے 'لٹل' کہہ کر پکار رہا تھا۔ ہر ملاقات ایک نئی کہانی لاتی تھی، ایک نئے تحفے کے ساتھ۔ وہ لائٹو والے بلونز اور لولی پاپس صرف تحفے نہیں تھے، بلکہ اس کی محبت کی زبان تھے۔ وہ اسے ہمیشہ ایک چھوٹی سی معصوم لڑکی کی طرح دیکھتا تھا، جس کے ریشمی بالوں اور چمکتی آنکھوں میں ایک سحر سا سما تھا۔ اس کی مسکراہٹ اُس کے لیے ایک طلسم تھی، جس سے وہ خود کو آزاد نہیں کر پاتا تھا۔

"میں اب چھوٹی نہیں رہی جس کے لیے آپ لولی پوپس اور کھیلنے کے لیے بلونز لے کر آئے ہیں۔" نجانے مشعل کو کیا ہوا تھا کہ غصّہ آنکھوں میں سجائے اُسنے نروٹھے پن کی انتہا ہی کر ڈالی تھی۔

سلمان متواتر بولا: "چاہے جتنی مرضی بڑی ہو جاؤ مجھ سے ہمیشہ چھوٹی ہی رہوں گی۔

پروفسر ہمدان ابو کے آفس میں کیا کر رہے تھے ؟؟ اور اپنے اُن پر گولیاں کیوں چلائی تھیں۔ مشعل کا اچانک سوال غیر متوقع نہیں تھا لیکن پھر بھی سلمان رضا گیلانی کے طباق چہرے پر پھیلی مسکراہٹ پر غالب آ گیا تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہیں، امی بھی آرام کرنے کا کہہ کر گئی ہیں، اپنے کمرے میں جاؤ آرام کرو۔"

وہ زرا ٹھہر کر تحمل سے بولا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اُسکے لہجے میں سختی در آئی۔ وہ کل والے ہوئے واقعے پر اُس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اُسکے بخار کی وجہ بخوبی اچھے سے جانتا تھا۔

آفس میں ہوئی توڑ پھوڑ آپ ٹھیک کرواسکتے ہیں، سارے ثبوت، سبھی کا منہ بند کرواسکتے ہیں۔ لیکن۔۔ میرا نہیں۔۔۔

"You probably don't know that Professor Hamdan can file an Attempt to Murder case against you."

اُسکے لہجے کی سفاکی اور نگاہوں کہ وارفتگی دیکھ کر سلمان رضا گیلانی ششدر رہ گیا۔

"اگر اُن کی سمت چلی گولیوں کی زد میں وہ مرے جاتے تو؟؟۔"

مشعل آخر پر قدرے ٹھہراؤ سے ذرا گھبرا کر بولی۔

"بیٹوں کے ہاتھوں مجبور اور بے بس باپ کو ویسے بھی مر جانا چاہیے۔" سلمان نے کچھ سوچ کر بولا اس کے لہجے میں نہ صرف تاسف بلکہ تضحیک اور حقارت کی رمق بھی واضح تھی۔ سلمان کے چہرے پر ٹھہریں مشعل کی پر سوچ نگاہوں میں اب تفکر بھی اتر آیا۔

)خیال:(

میری اس پسٹل میں پوری "چھ" گولیاں تھی لفظ چھ پر زور دیا گیا۔ پانچ گولیاں تو ایویں ہی ضائع ہو گئی۔ یونہی ضائع ہونے والی گولیاں بھی اس کے پکے نشانہ باز ہونے کی گواہی چیخ

چیخ کر دے رہی تھیں۔ اب اس میں صرف ایک گولی بچی ہے۔ جسکے چلنے سے "یقیناً" تمھارا بیٹا میرے ہاتھوں سے ضائع ہو گا۔ اُسکی وحشت کے آگے پروفیسر ہمدان سراسیمہ ہونے لگے۔ گولی جب اس کے "یہاں" لگے گی، سلمان نے اپنے ماتھے پر شہادت والی انگلی بیچ میں رکھ کر خونخوار نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "تو مشعل کا خیال اس کے دماغ سے ایک جھٹکے میں نکل جائے گا۔" سلمان کے لہجے کی سنگینگی نے پروفیسر ہمدان کے حواس سلب کر دیے اور چہرہ بالکل فق کر دیا۔

...

"میرا یقین کریں! مشعل بولتے بولتے رکی، اسکی سانسوں میں ایک رکاوٹ سی آئی اور گلے میں گلٹی سی ابھری، اور اُسکی آنکھوں آنسوؤں سے بھر آئیں جبکہ آنسو کا ننھا قطرہ آنکھیں کی قید سے ٹوٹ کر اُسکی گال پر لٹکنے لگا۔

جیسے شیشے کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا، یا پھول کا ایک نازک پتہ جو موسم کے آخری سانس کے ساتھ زمین پر گر گیا ہو، یا دریا کا ایک قطرہ پانی جو اپنے منبع سے الگ ہو کر واپس آ گیا ہو۔

"میں نے کبھی اُسکے بارے میں نہیں سوچا، اس کے جذبات یک طرفہ ہیں، میرے دل میں اُسکے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میں نے کبھی اُسکی حوصلہ افزائی نہیں کی، ہمیشہ اپنے والدین کی عزت کا پاس رکھا ہے۔"

اب آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر متواتر اُسکے رخسار پر بہتے ٹپ ٹپ اُسکے نرم و ملائم نازک سے مرمریں ہاتھوں پر گر رہے تھے، جیسے پتیوں پر سے شبنم کی بوندیں گر رہی ہوں، اور اُسکی سانسوں میں غم و ہیبت کی لہر دوڑ گئی۔ اُسکے دل کی گہرائیوں سے ایک چیخ نکلی، جو خاموشی کے بوجھ تلے دب گئی۔ کیونکہ وہ اس محبت کا انجام بخوبی جانتی تھی۔

سلمان مشعل کیطرف قدم بڑھاتا ہوا اُسکے قریب آ کر رکا، لیکن مشعل وہاں سے روتے

ہوئے بھاگ گئی۔ سلمان نے اُسے جانے دیا، لیکن اُسکے دل میں ایک درد بڑھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھا کہ مشعل اُس سے کیوں بھاگ رہی ہے۔

اب سلمان کی پُر سوچ نگاہوں نے مشعل کے بوجھل ہوتے وجود کا دور تک پیچھا کیا تھا۔ مشعل سمجھ کیوں نہیں پائی کہ سلمان کو اُس پر پورا یقین ہے۔ جسکے لیے اسے کہنے کی ضرورت نہیں۔ سلمان نے اپنے قدموں کو مشعل کی طرف بڑھایا، لیکن پھر رک گیا۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ مشعل کو کیسے روکا جائے؟

سلمان کی آنکھوں میں نمی چمکی اور اُسکی دھندلی نگاہوں کے سامنے سے مشعل کا وجود غائب ہو گیا تھا۔ پیچھے وہ شش و پنج میں مبتلا خود کو کوسنے لگا۔

~~~~~~~~

وہ اپنے کمرے میں تھی، جہاں تاریکی کے بادل چھائے ہوئے تھے، لیکن چمکتے ہوئے غبارے اس تاریکی کو نگل کر پورے کمرے میں ایک خاص چمک پھیلا رہے تھے۔

)ماضی(۔۔۔

مشعل، اپنی تخلیقی دنیا میں محو، سفید کاغذ پر اس کی پنسل کا رقص رنگوں کا ایک جادو بکھیر رہا تھا۔ اس کی پنسل، نرمی سے کاغذ پر سرسراتی ہوئی، ایک خوبصورت پھول کو جنم دے رہی تھی۔ ہر پنکھڑی، ہر پتا، اس کے دل کی نرمی کا آئینہ تھا۔ اسی اثناء میں، سلمان نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مشعل سر اٹھا کر مسکرائی۔ سلمان نے بے چینی سے پوچھا، "مشعل، کیا تم زرمین کو مجھ سے ملوا سکتی ہو؟ مجھے اس سے کچھ اہم بات کرنی ہے۔" مشعل نے اپنی پنسل نیچے رکھی اور شرارت سے مسکرائی۔ "ضرور، لیکن فیس لگے گی۔" سلمان حیران رہ گیا۔ مشعل نے مزید کہا، "لائٹوں والے بلونز، ڈھیر ساری چاکلیٹس اور..." سلمان
~~~~~~~~

نے ہنستے ہوئے کہا، "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن لولی پاپس میری طرف سے فری ہیں۔" مشعل نے اپنی بات جاری رکھی، "اور ایک سفید پھول بھی۔" سلمان نے سوچ میں پڑ کر کہا، "پھول بھی تمہیں دے دوں گا تو زرمین کو کیا دوں گا؟" مشعل نے مسکرا کر جواب دیا، "بے فکر رہیں، اُنہیں یہ سب نہیں پنسد وہ ان سے زیادہ کی خواہش رکھتی ہیں۔" سلمان نے حیرت سے مشعل کی طرف دیکھا۔ "مثلاً؟؟" مشعل نے رنگوں میں ڈوبی آنکھوں سے کہا، "یہ تو آپ اُن سے پوچھئے گا۔"

~~~~~~~~~

اُسنے بڑے بڑے غباروں کو اپنے ہاتھوں میں لیا تو غباروں کی رنگ برنگی چمک اُسکے دل شکن چہرے پر پڑ کر اُسی پریشانی کو بیان کرنے لگی جس میں وہ گھری ہوئی تھی۔

اچانک اُسکے ذہن میں سلمان کی باتیں گردش کرنے لگیں۔ تبھی اُسکی سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی، دل بے ترتیب دھڑکتا تھا کہ کمرے کی خاموشی میں وہ اپنی دھڑکنوں کی آواز واضح سن سکتی تھی۔

ایکا ایکی سلمان رضا گیلانی کی باتیں اُسکے ذہین میں گردش کرنے لگیں اور گردش کرتی چلی گئیں۔ اب اُسکی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ کمرے کی خاموشی میں وہ اپنی دھڑکنوں کی آواز واضح سن سکتی تھی۔

اسنے کمرے میں موجودہ فضا ممیں کھڑے غباروں کی دوڑ ایک ہاتھ میں پکڑ کر، اور دوسرے ہاتھ سے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کی ننھی بوندوں کو صاف کیا اور ایک لمبی سانس لے کر خود کو نارمل کرنا چاہا۔

لیکن کمرے میں اسکا دم ابھی بھی گھٹ رہا تھا تھا، وہ خود کو نارمل نہیں کر پا رہی تھی۔ اسلئے
~~~~~~~~~

وہ بیڈ پر سے اٹھ کر کمرے کے ساتھ بنی چھوٹی سی بالکونی میں آ گئی۔

تازہ ہوا کے چھونے سے اس کے صبیح چہرے پر سکون کی لہر دوڑی تو اس نے راحت کی سانس لی۔

دوسری طرف راحیلہ بیگم نے سلمان کو گھر چلنے کا اشارہ کیا۔ اور ساتھ ہی مشعل کے بارے میں پوچھنے پر ناہید بیگم نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ اس پر سلمان نے بھی مشعل کو بغیر ملے گھر چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

"جہاں پر کش چیزوں کی روح آزاد ہے، وہاں انہیں قید کرنے کی کوشش کرنا، ان کی اصل وجود کو دبا دیتا ہے۔ آزاد روحوں کو آزاد چھوڑ دینا ہی ان کی اصل شکل میں رہنے کی ضمانت ہے۔ اس لیے، ہمیں چیزوں کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ وہ اپنی اصل شکل میں رہ سکیں اور اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکیں۔"

جب مشعل نے غباروں کی ڈوری کو اپنے ہاتھوں کی نرم گرفت سے آزاد کیا، تو زرمین کی بات اس کی یادوں میں اچانک ابھر آئی، جہاں پر کش چیزوں اور روحوں کی آزادی اُنکی ہستی کی بنیاد، اور زندگی کی صحیح معنی، فطرت کی اصل شناخت، وجود کی حقیقی قیمت، ذاتی آزادی اور خودداری کی علامت تھی۔

واپسی کیلئے سلمان نے گھر کی محدود حدود کو چھوڑ کر کھلی فضا میں قدم رکھا، جہاں جھلملاتے غبارے سیاہ آسمان پر آزاد پرواز کرتے دکھائی دیئے۔ وہ اپنی جگہ ٹھہر گیا، اس کی نظروں میں ایک نئی دنیا کھل گئی۔ مشعل اور سلمان دونوں نے آسمان پر آزاد غباروں کو تاروں میں بدلتے دیکھا، ان کی مضمحل نظروں سے ان کی زندگی کی چمک اُمڈ آئی۔

غباروں کی پرواز ان کی زندگی کو بھی ایک نئی روشنی کی کرن دے رہی تھی، یونہی وہ تاروں کی طرح چمکتے ہوئے چھوٹے ہوئے تو مشعل نے بالکونی کے لکڑی کے تختے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر گردن جھکائی، اس کے دل میں ایک گہرا سکون اٹھا اور روح خوب

توانائی سے لبریز ہو گئی۔

•°•°•°•°•°•°•°•°•°•°•°•°•°•

((" زرمین کا کردار، روایت کے تانے بانے میں اُلجھا ہوا ایک معمہ سا ہے، جو کہانی کے پس منظر میں ایک مبہم سایہ کی مانند لہراتا رہتا ہے۔ اس کی شخصیت کی گہرائیوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں وقت کی دھارے کو پلٹ کر دیکھنا ہو گا، جہاں ماضی کے راز کھُل کر سامنے آئیں گے۔ "))

))ماضی """"""((

یونیورسٹی سے لوٹ کر جب زرمین گھر میں داخل ہوئی تو کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوؤں کا سیلاب اس کی جانب اُمڈ آیا۔ ہر طرف لذیذ کھانوں کی مہک بھری ہوئی تھی؛ کڑھائی میں مسالے دار گوشت کی بھوننے کی تیز تیز مہک، زعفران کی نازک خوشبو اور کشمیری مرچوں کی آگ نے اس کی بھوک کو اور بڑھا دیا۔ بریانی کی بھاپ اٹھ رہی تھی اور بادام کے حلوہ کی مہک پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ ترین ہوٹل کے لاؤنج میں کھڑی ہے جہاں ہر طرف مہمانوں کی آمد کا انتظار کیا جا رہا ہو۔

گھر کا ماحول ایک خوشگوار اور آرام دہ سا لگ رہا تھا۔ اب وہ کچن کی جانب بڑھی اور وہاں پہنچ کر اسے انابیہ، مشعل اور ناہید بیگم کو خوشگوار گفتگو میں مصروف پایا۔ انابیہ کو دیکھ کر

زرمین کی آنکھوں میں دوری کے زخموں کو تازہ کرنے والے آنسو اتر آئے، لیکن ساتھ ہی دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی خوشی کے آنسو بھی اس کی پلکوں پر لٹک رہے تھے۔ خوشی اور غم دونوں ایک ساتھ اس کے دل میں رقص کر رہے تھے۔ غیر متوقع طور پر انابیہ کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بے یقینی اور حیرانگی کے عالم میں کھو سی گئی، جیسے وہ ایک لمحے کے لیے پوری دنیا بھول گئی ہو۔ پھر یکلخت زرمین کو ایک غیر معمولی کشش محسوس ہوئی اور وہ انابیہ کی جانب بڑھی اور اس کے ہاتھوں کو اپنی انگلیوں میں قید کر لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گہری نظروں کے حصار میں لیا اور اسی لمحے گویا وقت اپنی رفتار کھو بیٹھا ہو اور دنیا ایک خواب میں ڈوب سی گئی۔ انابیہ کی آنکھوں میں وہ اپنی بچپن کی ساری یادیں دیکھ رہی تھی اور خوشی اور غم کے ملے جلے احساسات اسے ڈبو رہے تھے۔ جیسے ایک پرندہ آسمان کی بلندیوں پر اڑتے ہوئے اپنی گہرائیوں میں اتر آیا ہو۔ ناہید بیگم اور مشعل دونوں اس منظر کو خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔ دونوں زرمین کے لیے مطمئن تھیں۔

"تم یہاں کیسے؟" زرمین کی آواز میں ایک تلخ مٹھاس سی رچی ہوئی تھی جیسے کوئی پرانا زخم تازہ ہو گیا ہو۔ وہ انابیہ کو ایک گہری نظریں گداڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ یہ سوال ایک طعنہ سا لگ رہا تھا، مانو کہ کوئی تیز تیر سیدھا دل میں جا لگا ہو۔ "ایک دعوت نامہ ہی میری آمد کا پاسپورٹ بنا، اور میں، شائستگی کے قید خانے میں قید، انکار کے فن سے ناواقف، یہاں حاضر ہوں۔" اس کے الفاظ سے اس کی بے بس کیفیت عیاں تھی۔ انابیہ نے اب زرمین کو نرمی سے گلے لگایا، "مطلب یہ ہے کہ ابو نے تمہیں دعوت دی ہے۔" زرمین نے انابیہ کے بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑا اور سوال کیا، "صرف تمہیں؟" اس کی آواز میں ایک بے بسی سی تھی، جیسے کوئی پرندہ پھندے میں پھنس گیا ہو۔ یہ

سوال اس کے دل میں موجود شک وشبہ کا اظہار کر رہا تھا۔

"شاید ہاں،" انابیہ نے رسانیت سے جواب دیا، مگر اسکی آواز میں بھی ایک عجیب سی خوفزدہی تھی۔

"صرف انابیہ کو؟" زرمین نے انابیہ کو خود سے جدا کرتے ہوئے ناہید بیگم کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ناہید بیگم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا، "نہیں بیٹا، انابیہ کی فیملی اور تمہاری پھوپھو بھی آئیں گی۔" پھوپھو کا نام سنتے ہی زرمین کا چہرہ ابر آلود ہو گیا۔ وہ فوراً انابیہ کا ہاتھ پکڑ کر کچن سے نکلتی ہوئی کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ گویا پھوپھو کا نام اس کے دل میں دبا ہوا ایک زخم تھا، جس پر کوئی انگلی رکھ دیتا تو وہ چھلک اٹھتا۔ "انا۔۔۔ آؤ میرے کمرے میں بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے بہت کچھ بتانا ہے تمہیں۔" زرمین کی آواز میں ایک التجا سی تھی، جیسے کوئی بچّہ اپنی ماں سے سہارا مانگ رہا ہو۔

"میں نے تمہیں بار بار فون کیا، لیکن تم نے میری ایک بھی کال نہیں اٹھائی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں تمہارے لیے کچھ نہیں ہوں۔" زرمین کی آواز میں مایوسی کا لہجہ تھا۔ میری شادی کا دن میری زندگی کا سب سے اہم اور خاص دن تھا جیسے ایک روشن ستارہ جسے تمہاری عدم موجودگی نے گرہن لگا دیا تھا، تمہارے نہ ہونے کی وجہ سے میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور میرا دل پاش پاش ہو گیا تھا۔ "

انابیہ نے سر جھکا لیا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم ناراض ہو گی۔ لیکن ابو نے مجھے سختی سے منع کیا تھا۔ میں اُن کی نافرمانی نہیں کر سکی اس لیے مجبور تھی۔"

اسی دوران، ناہید بیگم نے کمرے میں قدم رکھا۔ ان کی آنکھیں فوراً زرمین کے چہرے پر ٹکرائیں، جیسے وہ زرمین کے دل میں اترنے والی طوفان کو پڑھ سکتی ہوں۔ "انابیہ، کھانا لگ گیا ہے۔ تم جا کر کھالو۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ انابیہ نے زرمین کو بغیر دیکھے

اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جی انٹی، ٹھیک ہے۔"

" انابیہ، تم جاؤ۔ مجھے زرمین سے کچھ بات کرنی ہے۔" ناہید بیگم نے انابیہ کو باہر بھیج دیا اور پھر زرمین کی طرف متوجہ ہوئی۔

~~~~~~~~

انابیہ کے کمرے سے جانے کے بعد ناہید بیگم زرمین کی جانب بڑھی۔ "زرمین! تمہارا رویہ بہت خراب ہوتا جارہا ہے تمہاری پھوپھو لوگوں سے۔" ناہید بیگم نے تنہائی میں اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے امی۔" زرمین صاف مکر گئی۔ "ایسی ہی بات ہے۔ تمہاری پھوپھو کس قدر پیار سے تمہیں گلے لگا رہی تھیں اور تم منہ بنا کر ایسے مل رہی تھی جیسے کوئی احسان کر رہی ہو۔"

" میرا دم گھٹتا ہے ایسی قربت سے۔" زرمین کے کہنے پر ناہید بیگم نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا۔

"وہ اتنی زیادہ سادہ ہیں کہ تمہارا رویہ بھی محسوس نہیں کرتیں لیکن مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ اتنی گرم جوشی کا جواب ایسے دیا جاتا ہے اور سلمان کو بھی تم اتنا نظر انداز کرتی ہو۔ کزن ہے وہ تمہارا۔ ڈھنگ سے سلام بھی نہیں کرتی تم۔"

ناہید بیگم کی بات پر زرمین نے لب بھینچ لیے۔

"وہ کزن کے علاوہ ایک اور رشتہ بنانے کا خواہشمند ہے جو ممکن نہیں ہے۔"

"کزن سے ہٹ کر تم سے ایک رشتہ بندھا ہوا ہے اس کا زرمین! تم اس کی بچپن کی منگ ہو۔" ناہید بیگم نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"میں نہیں مانتی بچپن کے طے شدہ رشتوں کو۔" زمین بپھر اٹھی۔
~~~~~~~~

"کیا کمی ہے سلمان میں ؟؟ تعلیم یافتہ نہیں، خوبصورت نہیں، پیسے والا نہیں، ناہید بیگم بھی غصہ ہوئی۔

"وہ میرا آئیڈیل نہیں۔" وہ اطمنان سے بولی تھی۔ ناہید بیگم نے اچنبھے اسے دیکھا۔

"اور تمہارا آئیڈیل کیا ہے ؟؟" ناہید بیگم نے زرمین کو گھورتے ہوئے دانت بھیج کر پوچھا۔

"میرا آئیڈیل زمین داری اور روایتوں میں الجھا ہوا، گاؤں میں رہائش پذیر، شلوار قمیض میں ملبوس ایک ایسا شخص نہیں جو کسی لڑکی سے اظہار کی ہمت بھی نہ رکھتا ہو۔" زرمین نے تمسخرانہ انداز میں کہا تو ناہید بیگم حیرت میں پڑ گئی۔

"یعنی تمہیں بے باک اور منہ پھٹ لڑکے پسند ہیں جو نہ بڑوں کا لحاظ کرتے ہوں، نہ معاشرے کی حدود کا خیال ؟"

ناہید بیگم کے سوال پر زمین خاموش رہی۔

آج سے پہلے تمہارے رویے اور بے زاری کو میں صرف تمہارا بچپنا سمجھ رہی تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اس حد تک متنفر ہو سلمان سے۔ اس کے لائف اسٹائل اور اس منگنی سے۔ مجھے افسوس ہے ہو رہا ہے تمہاری سوچ پر وہ ایک پڑھا لکھا بندہ ہے۔ اپنی زمینداری سے اتنا اسٹیبلش ہے کہ اس کے کو ہزاروں روپے کی نوکری کرنے کی ضرورت نہیں۔ رہی بات لباس کی تو یہ ہمارا کلچر کا حصہ ہے۔

ناہید بیگم نے تفصیل سے بات کی لیکن زرمین کے چہرے کے پتھریلے تاثرات جیسے تھے ویسے ہی رہے۔

" میں ایک قید خانے سے نکل کر دوسرے قید خانے میں نہیں جانا چاہتی۔" زرمین کے لبوں سے نکلا یہ جملہ ایک فلسفیانہ سوال کی مانند تھا، جس نے ناہید بیگم کے وجودی تشویشوں کو بیدار کر دیا۔ زرمین کی آواز میں ایک ایسی مایوسی تھی، جیسے کوئی قفس میں

بند قناری اپنے سنہرے پنجرے سے آزادی کی خاطر فغان کر رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ایک ایسی بغاوت بھری تھی، جو کسی اُفانی طوفان کی مانند تباہی کا پیش خیمہ تھی۔ ناہید بیگم حیران تھی، جیسے کوئی پکڑا ہوا پرندہ اپنے پنکھ پھڑ پھڑا کر اپنی آزادی کا اعلان کر رہا ہو۔ کیا آزادی صرف ذہنی اور روحانی قید سے آزاد ہونا ہے، یا پھر یہ ایک وسیع تر جستجو ہے؟ زرمین کا یہ سوال ناہید بیگم کو اپنی ذات کے اندرونی سفر پر آمادہ کر رہا تھا۔

°•°•°•°•°•°•°•

AESTHETIC NOVELS
EXPLORE, DREAM AND READ
IG:AESTHETICNOVELS.ONLINE

AESTHETIC NOVELS
EXPLORE, DREAM AND READ
IG:AESTHETICNOVELS.ONLINE

قسط نمبر 2

(ماضی)

لو آ گئی تمھاری دشمنِ جاں۔ "زرمین کو دیکھ کر حماد کے اندر ایک نیا جوش پیدا ہو گیا، جیسے کوئی تیر انداز اپنا تیر چلانے کے لیے تیار ہو۔ احمر کی نظریں اس کی آنکھوں میں اتر گئیں، جہاں وہ ایک پوری کائنات دیکھنے لگا۔ زرمین، یونیورسٹی کے دالانوں میں قدم

رکھتے ہی، ایک پُراسراری راز کی مانند تھی۔ جیسے کوئی شاعر محبوب کی جمال پر مست ہو،

احمر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ لمحے بعد آہستگی سے بولا،

ایسی دشمن پر میرے یار، تیرے بھائی کی جان بھی قربان۔

اس کی روح میں ایک نئی بہار کا آغاز ہو رہا تھا، اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی زندگی میں زرمین ہی وہ رنگ ہے جس کی اسے تلاش تھی۔

"تم یہاں کھڑے ہو میں پوری یونیورسٹی میں تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ "

زرمین نے مسکرا کر کہا۔ اس کی مسکراہٹ تازہ صبح کی نسیم کی مانند تھی جو پھولوں کو کھلنے کا اشارہ کرتی ہوئی، اس کے چہرے پر ایک چمک پیدا کرتی تھی۔

ابھی تو آئی ہو تم، ڈھونڈ کب سے رہی تھی؟ "

احمر مصنوعی سنجیدگی سے سوال گو ہوا۔

" چل یار اب یہ آگئی ہے تو میں چلتا ہوں، مجھے کباب میں ہڈی بننے کا کوئی شوق نہیں۔"

حماد ایک اچٹتی نگاہ زرمین پر ڈالتے ہوئے اپنا بیگ اٹھا کر چلتا بنا۔

یہاں کھڑے ہو کر کس کا انتظار کر رہے تھے۔ "زرمین نے بے تابی سے پوچھا۔"

"ہے ایک پاگل، جس نے مجھے بھی پاگل بنایا ہوا ہے۔

احمر نے دھیرے سے کہا اور دو قدم آگے بڑھا۔

اگر وہ پاگل ہے تو تم کیوں اس کے پیچھے پاگل ہو رہے ہو، اور بھی بہت سی عقلمند لڑکیاں ہیں ناں؟

زرمین نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے مزاح میں کہا۔

ہاں، بہت ساری عقلمند لڑکیاں ہیں لیکن میرے پاگل پن کا علاج صرف اسی کے پاس ہے۔

احمر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ زرمین نے ہلکا سا مسکرا کر کہا،

سچ مچ پاگل ہو۔

اس کی آواز میں ایک نازک سی شرارت تھی، جیسے چاندنی رات میں کھلتے ہوئے پھول کی پنکھڑیوں پر شبنم کی بوند۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں؟ صحیح معنوں میں، میں ہوں پاگل۔"

احمر نے زرمین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھہراؤ سے کہا۔ اس کی آواز میں ایک عجیب سی شدت تھی، جیسے وہ کوئی راز کھول رہا ہو۔

"اور تمہارے لیے پاگل ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے"

اس نے اپنی بات کو دہراتے ہوئے زرمین کی نظروں میں گہرائیوں تک اترنے کی کوشش کی۔

پھر تو ہماری شادی ہونا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ ابو تو پہلے راضی نہیں ہوں گے، اور ایک پاگل کے ساتھ میری شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

زرمین نے اپنی پیشانی پر شکنیں بناتے ہوئے بے بسی کا نقشہ اپنے چہرے پر سجا کر گہری سانس لی اور فکر مندی کی بھرپور اداکاری کرتے ہوئے مصومیت سے کہا۔

"اوہ ہیلو بات سنو تم میری، اپنے ابو کی تو، تم مجھ سے بات ہی مت کرو۔"

یہ جملہ احمر کی بے بسی کو ظاہر کر رہا تھا۔

کالج کا مرکزی کوریڈور، صبح کی دھوپ میں چمکتے ہوئے، سفید رنگ کے مرمر کے فرش اور بلند چھت کے ساتھ، طلباء کی ہلچل سے گونج رہا تھا۔ کچھ طلباء کتابیں پڑھ رہے تھے، کچھ دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے اور کچھ اپنے فون میں مشغول تھے۔ احمر اور زرمین بھی اس بھیڑ میں شامل تھے۔ احمر نے زرمین کی جانب دیکھتے ہوئے، ایک ایسی لگن سے سوال کیا جیسے کوئی دریا اپنی منزل تک پہنچنے کی جستجو میں ہو۔

"یار تمہارے ابو تمہیں ایک فون بھی نہیں دلوا سکتے کیا؟"

احمر کی آواز میں ایک بے چینی سی تھی۔ اور اس کا یہ سوال، علم کے سمندر میں ایک چھوٹی سی لہر کی مانند اٹھا اور پھر غائب ہو گیا۔ زرمین نے خاموشی سے اس کی بات سنی، وہ جیسے کسی گہرے سمندر کی تہہ میں اتر کر سوچ رہی ہو۔

"کیوں؟ "

زرمین نے آہستہ سے پوچھا۔ اس کی آواز جیسے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ احمر کی پریشانی بڑھتی چلی گئی،

"کیا مطلب کیوں؟"

یہ سوال میرے دل میں ایک کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔

جب تم دیر سے یونی آتی ہو یا چھٹیوں پر ہوتی ہو، تو میں پریشان ہو جاتا ہوں، کم از کم فون پر بات کر لیتے تو مجھے تسلی ہوتی۔

زرمین خاموشی سے اسکی بات سنتے ہوئے کلاس روم کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ جیسے کسی راز کو اپنے دل میں چھپا کر چل رہی ہو۔ احمر نے عاجز آ کر پوچھا،

"میں تمہیں فون دلوا دوں؟ "زرمین نے بنا رکے بول رہی تھی،" کتنی بار میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ"

میرے ابو کو نہیں پسند کہ لڑکیوں کے ہاتھوں میں فون رہے اور وہ ہر وقت اس پر مصروف رہیں۔ "احمر حیران رہ گیا، جیسے کوئی خواب ٹوٹ گیا ہو۔

"ایک منٹ، آج کل تو ہر بچے کے ہاتھ میں اسمارٹ فون ہوتا ہے اور اس میں برائی کیا ہے؟"

زرمین نے اطمینان سے بولتی ہوئی آخر پر شش و پنج میں مبتلا ہو گئی،

برائی فون میں نہیں، لوگوں کے ذہنوں میں ہے۔ جو لڑکیوں کے ہاتھوں میں فون دیکھ کر پتہ نہیں کیا کیا سوچ لیتے ہیں۔

،احمر نے سکون و اطمینان سے دوبارہ سوال گو

"یعنی کہ تمہارے ابو تم پر بالکل بھی یقین نہیں کرتے؟"

،زرمین نے قدرے تحمل سے جواب

ابو کو ہم پر پورا یقین ہے، بس وہ نہیں چاہتے کہ کوئی بھی ایسی بات ہو جس پر لوگ کچھ غلط کہہ دیں۔

،احمر نے ٹھہراؤ سے بولتے رسانیت سے

ہمممم۔۔۔اچھا اچھا! یعنی مجھے یہ سمجھنے دو کہ تمہارے ابو تم سے پیار کرتے ہیں، اُنہیں تم پر پورا یقین ہے۔ لیکن وہ لوگ کی بہت پرواہ کرتے ہیں، یہ کون سا لاجک ہوا؟

احمر نے حیرت سے پوچھا۔ زرمین نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا اور پھر دھیرے سے جواب دیا،

اُس انسان کی لاجک تم کبھی نہیں سمجھ سکتے جس کی نوجوان بیٹیاں ہوں اور ہر وقت دنیا کے نشانے پر ہوں، کہ جیسے اُن سے کوئی غلطی ہو اور کوئی بات بنے۔

احمر کی روح میں ایک اضطراب سا پھیل گیا جب اس نے زرمین کی بات سنی۔

یہ معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ " زرمین کی آواز میں مایوسی سنائی دی جب اس نے متفق ہو کر کہا، "ہاں! جہاں لڑکیوں کو ہمیشہ ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے، ایک شک کی نگاہ سے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں لڑکیوں کو آزادانہ زندگی گزارنے کے مواقع نہیں ملتے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں لڑکیوں کو صرف گھر اور باورچی خانے تک محدود کر دیا جاتا ہے۔

احمر نے خاموشی سے زرمین کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی نظریں زرمین پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا،

"چلو، کینٹین چلیں اور کچھ کھاتے ہوئے اس سب کو بھول جاتے ہیں۔ "

احمر کو محسوس ہوا کہ اس کے اندر ایک خلا سا پھیل گیا ہے۔ وہ اس وقت ایک مشکل اور پیچیدہ موضوع پر بات کر رہا تھا جس نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔

کنٹین چلیں "کہہ کر وہ اس کشمکش سے دوری چاہتا تھا۔ "

یہ ایک طرح کا دفاعی ردِ عمل تھا جس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو اس جذباتی دباؤ سے بچانا چاہتا تھا۔

جی نہیں، شکریہ۔ میں گھر سے ناشتہ کر کے آئی ہوں۔ ویسے بھی کلاس کا وقت ہو گیا ہے اور کلاس بھی آ گئی ہے۔

چلو کلاس میں چلتے ہیں

احمر نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا اور خاموشی سے زرمین کے پیچھے کلاس میں چلا گیا اسے لگا کہ اس موضوع سے جان چھڑوانے کا یہ بھی ایک اچھا طریقہ ہے۔

..☆...☆...☆..

زری کے ابو، مہتاب صاحب، کے دل کے تار اس وقت سے بے چین تھے، گویا کوئی ناگفتہ بات انہیں اندر ہی اندر پریشان کر رہی ہو۔ ناہید بیگم کی آنکھیں ان کے ماتھے پر پڑی شکنیں پر ٹھہریں۔ چائے کے کپ کی گرمی اس کے ہاتھوں میں سرایت کرتی رہی، مگر اس کا دل آتش پاش ہوتے ہوئے دھڑکنوں سے گونج رہا تھا۔ وہ چائے کا کپ ہاتھوں میں لیے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے، ان کے چہرے پر پسیجی ہوئی تھی۔ اور آنکھیں گھبراہٹ سے چمک رہی تھیں۔

"زری کے ابو، آپ کے چہرے پر منڈلاتے سائے دیکھ کر میں پریشان ہو رہی ہوں۔ آپ کیوں پریشان ہیں؟ "ناہید بیگم نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔ آج یونیورسٹی سے

زرمین کو لیتے ہوئے ایک نامعلوم نظر نے اسے گھورا تھا، ایک ایسی نظر جس میں سوالوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ اور وہ لڑکا، (احمر)، اس کی روح میں ایک اضطراب کی لہر اٹھا گیا تھا۔ بتاتے ہوئے مہتاب صاحب کے دل میں ایک گہرا خوف سرایت کر گیا تھا، گویا کوئی اندھیرا سایہ ان پر منڈلا رہا ہو۔ مہتاب صاحب نے ڈوبتے دل سے ناہید بیگم سے سوال کیا۔" کیا یہ صرف ایک بے وجہ کا شبہ ہے، یا کچھ اور ہے؟"

ناہید بیگم نے ایک گہری سانس لی اور کہا،" زری کے ابو، یہ دنیا بہت بڑی ہے اور لوگ بہت سے طرح کے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم ان کی نگاہوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ شاید وہ لڑکا صرف ایک لمحے کے لیے ہماری زرمین کی طرف متوجہ ہوا ہو اور اس کا کوئی گہرا مطلب نہ ہو ". ناہید بیگم نے ایک نرم اور پرسکون انداز میں بات کرتے ہوئے ان کی تشویشوں کو کم کرنے کی پوری کوشش کی۔

"ناہید، میری دونوں بیٹیاں میرے جگر کا ٹکڑا ہیں۔ وہ میری روح کا عکس اور میرے وجود کی جان ہیں۔ آپ اور میری دونوں بچیاں میری زندگی کا وہ قیمتی اثاثہ ہو جنہیں میں اپنی آنکھوں کی زینت سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ دنیا کی برائیاں ان کو چھو لیں، اس لیے میں نے انہیں کچھ خاص ضوابط کے تحت رکھا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمیشہ محفوظ رہیں اور کسی بھی قسم کی مصیبت میں نہ پڑیں ". مہتاب صاحب کی آواز میں فکر کی گونج اور بے بسی کا سوز اس قدر گہرا تھا کہ سننے والا بھی ان کی پریشانی میں شریک ہو جاتا۔ ان کی پریشان آواز سے ان کے دل کا حال آشکار تھا۔

"میں جانتی ہوں۔ لیکن ہم اسے بہت زیادہ محدود بھی نہیں کر سکتے۔ اسے اپنی زندگی گزارنی ہے اور اس کے لیے اسے کچھ آزمائشوں کا سامنا بھی کرنا پڑے گا ". ناہید بیگم نے خشک لبوں پر زبان پھیری، اور مہتاب صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ اس کی آنکھیں میں اندھیرا چھا گیا تھا، جیسے وہ کسی گہرے کنویں کی تہہ

میں جھانک رہی ہو، اور پھر مایوسی سے لب کشا ہوئی۔ اس کی آواز میں ایک بے بسی تھی جو اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھ رہی تھی۔ مہتاب صاحب نے ناہید بیگم کا ہاتھ اپنی انگلیوں میں جکڑ لیا، ان کی نگاہوں میں ایک ایسا غم تھا جو ناہید بیگم کے دل میں اتر گیا، جیسے وہ دونوں ایک ہی درد کو بانٹ رہے ہوں۔ تبھی ناہید بیگم نے محسوس کیا کہ مہتاب صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سا ساکت تاثر تھا، جیسے وہ اپنی ساری باتیں کسی کے دل میں اُتار رہے ہو۔ اسی دوران ناہید بیگم کو ہوا کی سرد سسکار نے چونکا دیا۔ بے چین ہو کر، وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ اس لمحے، اس کی نظروں نے دیوار پر ایک دھندلا سایہ دیکھا جو روشنی اور اندھیرے کے درمیان رقص کر رہا تھا۔ اس مبہم تصویر نے ناہید بیگم کو گہری سوچ میں ڈال دیا۔ اس کی نگاہیں اس سایے پر ٹکی رہیں، اور اس کے دل میں ایک عجیب سا خوف و ہراس اور تجسس کا امتزاج تھا۔ " زرمین ؟؟ "ناہید بیگم کے لبوں سے " زرمین "کا نام خشک پتے کی طرح جھڑا اور دل میں ایک سوال اٹھا: کیا یہ زرمین ہی تھی جو چپکے سے انکی ساری باتیں سن رہی تھی؟

زرمین نے اب اپنے کمرے میں آکر قدم رکھا جہاں ایک چھوٹے سے لیمپ کی کثیف روشنی تاریکی کے اندھیرے کو چیر رہی تھی۔ دروازے کو آہستہ سے بند کر کے، وہ اپنے بستر کے کنارے پر آ بیٹھی، جیسے کوئی تھکا ہوا پرندہ اپنے گھونسلے میں لوٹ آیا ہو۔ اس کی نگاہیں مشعل پر ٹکی ہوئی تھیں، جو نیند کے نرم بادلوں کی چادر اوڑھے، خوابوں کے رنگین باغ میں کھوسی تھی، جہاں ہر پھول اُسے ایک نئی کہانی سنا رہا تھا، اور کھڑکی سے آنے والی چاندنی کی کرنیں اس کے معصوم چہرے پر ناز ناز سے اتر رہی تھیں اور اس کے لمبے بالوں میں اُلجھ کر سونے کے تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہوا کا نرم جھونکا اس کے چہرے پر مسکرا رہا تھا اور پھولوں کی مہک اسے اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔

زرمین کو اپنی چھوٹی بہن کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے سکون ملا، لیکن یہ سکون دیرپا نہ تھا۔

اب زرمین نے اپنے ریشمی دوپٹے کو نرمی سے چھوا اور آہستہ اسے سرہانے رکھ دیا۔ وہ بستر پر چت لیٹ کر چھت کو دیکھتے ہوئے اپنے خیالات میں کھو گئی۔ اندھیرے میں گم چھت اسے ایک وسیع سمندر کی مانند محسوس ہو رہی تھی، جس میں وہ تنہا ایک کشتی کی مانند ڈوب رہی تھی۔ اس کے والدین کی آوازیں ابھی تک اس کے کانوں میں ایک لوری کیطرح گونج رہی تھیں، لیکن اب وہ لوری اسے ڈرا رہی تھی۔ آنکھیں بند کر کے زرمین نے اپنے اندر ایک گہرا سانس لیا، جیسے وہ اپنے آپ کو اس لمحے سے بچانا چاہتی ہو۔ دل میں ایک بے چینی سی اٹھ رہی تھی، جیسے کوئی نامعلوم سا خوف اور ایک ان کہا سچ اسے اندر سے کھوکھلا کر رہا ہو۔ خاموش کمرے میں صرف زرمین کی سسکیوں کا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دو گہرے گڑھے بن چکی تھیں، جیسے کوئی اندھیرا اس میں سما گیا ہو۔ ہر سانس کے ساتھ اس کا سینہ اٹھتا اور دبتا، جیسے کسی سمندر کی لہریں کسی کشتی کو تباہ کر رہی ہوں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بے نامی کشتی کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہو جو زندگی کے طوفان میں بہہ رہا ہے۔ زرمین کو اپنے والدین کی محبت و شفقت کو قید سمجھنے پر ایسا گہرا صدمہ پہنچا کہ وہ اب ان لمحات کو دوبارہ حاصل کرنے کی خواہش میں تڑپ رہی تھی۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

صبح کی تازہ ہوا یونیورسٹی کے سرسبز گراؤنڈ میں اُڑ رہی تھی۔ طلوع آفتاب کی نرم سنہری کرنی پھولوں پر چمک رہی تھیں اور درختوں کی شاخیں ہلکی سی آواز کر رہی تھیں۔ زرمین اور احمر ایک بنچ پر بیٹھے تھے۔ زرمین کی نگاہیں دور افق کی جانب تھیں جہاں آسمان اور زمین کا ملن ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی تھی، جیسے وہ کسی گہرے خیال میں کھو گئی ہو۔

(خیال):

"ناہید، میری دونوں بیٹیاں میرے جگر کا ٹکڑا ہیں۔
میں نہیں چاہتا کہ دنیا کی برائیاں ان کو چھو لیں، اس لیے میں نے انہیں کچھ خاص ضوابط کے تحت رکھا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمیشہ محفوظ رہیں اور کسی بھی قسم کی مصیبت میں نہ پڑیں۔"

~~~~~~

احمر نے زرمین کے مرمریں ہاتھ کی پشت پر اپنی انگلیاں پھیلا کر نرمی سے دباؤ ڈالا اور دھیمی آواز میں پوچھا، ”زرمین، تمھاری خاموشی مجھے بے چین کر رہی ہے۔ کچھ تو ضرور ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ مجھے بتاؤ، تمہیں کیا چیز پریشان کر رہا ہے۔“
~~~~~~

زرمین نے ایک سرد آہ بھری اور بھیگی آواز میں کہا، " مجھے بہت ڈر لگتا ہے احمر، ڈر لگتا ہے کہ یہ محبت کہیں مجھے اندھیرے میں دھکیل دے گی۔ "

احمر نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑا اور نرم لہجے میں کہا، " محبت اندھیرا نہیں، بلکہ ایک ایسی روشنی ہے جو اندھیروں کو چاک کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا پھول ہے جو دل کی خشک زمین میں پھوٹتا ہے اور اپنی خوشبو سے فضا کو معطر کر دیتا ہے، اور ہمیں ایک نئی دنیا کی طرف لے جاتا ہے۔"

زرمین نے احمر کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کی باتوں پر غور کیا۔ اسے احمر کی باتوں میں ایک سچائی محسوس ہوئی، لیکن پھر بھی اس کے دل میں ایک خوف کا سایہ تھا۔

زرمین کی آنکھیں اب دو اُبھرتے ہوئے چشموں کی مانند تھیں، جن سے آنسوؤں کے موتی ٹپک ٹپک ایسے گر رہے تھے، جیسے بارش کی بوندوں نے آسمان کو چھلنی کر دیا ہو۔

لیکن سماج کی نظر میں ہماری محبت ایک گناہ ہو گی۔ "زرمین نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

احمر نے اس کی نگاہوں میں جھانکا، جیسے وہ کسی گہرے سمندر میں ڈوب رہا ہو۔ زرمین کی آنکھیں اس کے دل کا آئینہ تھیں، جس میں اس کی تمام تر محبت اور درد واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

نہیں، زرمین، "اس نے نرم لہجے میں کہا،

"محبت ایک ایسا سفر ہے جو ہمیں ہمیشہ نئی منزلوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس میں ڈوب کر ہم خود کو پاتے ہیں۔ یہ سماج کی بنائی ہوئی دیواریں ہیں جو محبت کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہیں۔ لیکن سچا پیار ان دیواروں کو بھی پار کر جاتا ہے، جیسے کوئی دریا پہاڑ کر پہاڑوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا ہے، بالکل ویسے ہی "زرمین نے احمر کی آنکھوں میں ایک ایسی امید دیکھی، جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی

اس کے دل میں ایک خوف بھی تھا، ایک ایسا خوف جو اسے ایک کچھوے کی مانند اپنے خول میں سمیٹنے اور پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہا تھا۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

"ناہید، میں اس ہفتے بچوں کی منگنی کی چھوٹی سی رسم ادا کرنے کا سوچ رہا ہوں۔ "جب مہتاب صاحب نے یہ بات بتائی تو ناہید بیگم ڈھنگ سے خوش بھی نہ ہو سکیں۔ زرمین کی سرکشی کا تصور اس کے ذہن میں نقش ہو گیا۔

"فی الحال منگنی ہے، شادی نہیں۔ شادی کے لیے تو تمہارے بیچلر کے امتحانات تک انتظار کریں گے۔ "ناہید بیگم یہ بتاتے ہوئے خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

حسب توقع زرمین نے یہ بات سنی تو فوراً بھڑک اٹھی۔" میں نے کہا نا امی! مجھے سلمان سے شادی نہیں کرنی۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں ابو کو؟ "زرمین نے آواز بلند کی۔

"کیا بکواس لگا رکھی ہے زرمین! سلمان سے شادی نہیں کرنی تو کس سے کرنی ہے ہاں؟ آخر ایسا کون سا شہزادہ دیکھ رکھا ہے تم نے اپنے لیے جو بڑھ چڑھ کر انکار کیے جا رہی ہو؟ "ناہید بیگم کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ زرمین کو جھنجھوڑ کر پوچھ بیٹھیں۔

"میں احمر سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ "زرمین نے جواب دیا تو ناہید بیگم کچھ دیر ساکت رہ گئی۔" کون۔۔۔ کون ہے یہ احمر؟ "ناہید بیگم کی آواز میں لرزش تھی۔ سوال ان

کے ہونٹوں سے ایک اٹکتے ہوئے سانس کی طرح نکلا، جیسے کوئی پر اسرار راز سامنے آ گیا ہو، اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں ایک خاموشی چھا گئی۔

"ہماری یونی کے پروفیسر ہمدان کا بیٹا ہے وہ، اور مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اور میں بھی اُسے سے ہی شادی۔۔۔ "بات مکمل کرنے سے قبل اس کی آواز ناہید بیگم کے غصے سے بھرے ہوئے تھپڑ میں گم ہو گئی۔

"ہماری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی؟ جو تم ان راہوں پر چل پڑی۔ "ناہید بیگم نے نم آنکھوں سے اُسے گھورتے ہوئے تاسف سے پوچھا۔ انکا یہ سوال ایک تازیانہ کی مانند تھا جو زرمین کے دل پر لگا تو اس کے آنسو آنکھوں کی قید میں نہ رہ سکے۔

"مجھے اپنی زندگی پسند سے گزارنے کا پورا حق ہے امی۔ "آنسوؤں سے لبالب آنکھوں کے ساتھ، زرمین نے اپنی سرخ رخسار سے ہاتھ ہٹایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

زرمین کے کمرے سے جانے کے بعد ناہید بیگم کھڑکی کی سمت بڑھیں۔ باہر اندھیرا چھا رہا تھا اور ہوا میں ایک عجیب سا سناٹا تھا جس سے ناہید بیگم کو کچھ بُرا ہو جانے کا خوف سا محسوس ہوا۔ اس کی دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور اس کے ماتھے پر پسینہ چمک اٹھا۔

..☆...☆...☆..

(حال):

"کاشان نیو کنٹریکٹ کے معاہدے پر سلمان کے دستخط ناگزیر ہیں۔ "مہتاب صاحب نے سنجیدگی سے کاشان کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی، سر، میں جانتا ہوں، اس کے لیے مجھے ان کے گھر جانا پڑے گا۔ "کاشان نے میٹنگ روم سے تمام فائلیں اکٹھی کرتے ہوئے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

"تم رکو، میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ "مہتاب صاحب کا یہ جملہ سن کر کاشان نے حیرت سے سر ہلا کر اتفاق کیا۔

"وقت کی تیز رفتار اور زندگی کے تلخ تجربات نے سلمان اور میرے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی تھی کہ ہمارے رشتے کی مٹھاس تلخ یادوں میں بدل چکی تھی۔ خاندانی رشتوں کی پابندی نے بھی ہمیں اس دیوار کو گرا دینے سے روک رکھا تھا۔ خیر جو بھی تھا ہم نے کاروباری تعلقات کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے اختلافات کو دفن کر دیا، مگر سلمان کا میری عدم موجودگی میں دفتر میں آنا مجھے ہمیشہ پریشان کرتا رہا۔ وہ اب بھی اسی صنعت سے وابستہ ہے تو پھر میری موجودگی میں دفتر میں آکر کام کرنے سے کیوں کتراتا ہے؟ یہ سوال میرے دل میں ایک کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے اور میرا دل بے چینی سے بھر دیتا ہے۔"

مہتاب صاحب سنجیدگی سے سامنے بیٹھی اپنی بہن راحیلہ بیگم سے مخاطب تھے۔

"یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ رضا گیلانی کے تیس فیصد شیئرز اور انتھک محنتوں کی بدولت ہی آج میرا انڈسٹری کا نام آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہے، جس میں میرا بھی بڑا کردار ہے۔ اس لیے میرا آپ کی موجودگی یا عدم موجودگی میں آپکے آفس میں آنے کا برابر حق بنتا ہے۔ پھر چاہے میں جب مرضی آؤں جاؤں، آپ کا پریشان ہونا یا اعتراض کرنا بنتا نہیں ہے ماموجان۔ "سلمان، اپنی لمبی قامت اور موقر چال سے زینے اترتے ہوئے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے ایک مخصوص انداز میں بولا۔ اس کا لہجہ ایک طوفان کی مانند تھا جو سب کچھ اپنے راستے سے بہا دے رہا ہو۔

"پریشان ہونا یا اعتراض کرنا تب نہیں بنتا بیٹا، جب آپ کا دفتر آنے کا مقصد صرف کام کرنا ہو۔ "مہتاب صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر بولے تو اُن کی آواز میں سخت در آئی اور ان کی بھنویں آپس میں جڑ گئیں۔" لیکن آپکا مقصد صرف کام کرنا نہیں ہوتا، بلکہ کولیگز سے بُرا سلوک کرنا اور کلائنٹ سے برے طریقے سے پیش آنا بھی ہوتا ہے۔"

مکمل سیڑھیاں اتر کر سلمان اب ان کے مقابل آن کھڑا ہوا اور متواتر بولا۔

"پہلی بات وہ آپ کا کلائنٹ نہیں تھا، اور دوسری بات کہ میں اپنے کام کو بہت سنجیدگی سے لیتا ہوں اور اس لیے میں کبھی کبھار سخت لفظوں کا استعمال کر دیتا ہوں لیکن یہ کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں ہے۔ آپ کولیگز سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی کی بے عزتی نہیں کی۔"

سلمان نے نرم لہجے اور واضح انداز میں، ایک پیشہ ور کی طرح وضاحت دیتے ہوئے، آہستہ سے مہتاب صاحب کے پیچھے باادب کھڑے کاشان کو دیکھتے ہوئے کہا جو سلمان کی ہر بات بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

"سلمان، بیٹا، میں تمہاری بات کا اعتراف کرتا ہوں، لیکن ہمیں اس حقیقت سے آنکھیں نہیں بند کرنی چاہئیں کہ ہر فرد کے ساتھ احترام کا معاملہ کرنا صرف ایک اخلاقی فریضہ ہی نہیں بلکہ ہماری پیشہ ورانہ ذمہ داری بھی ہے۔ دفتر میں جس واقعے نے جنم لیا، اگر یہ کسی بیرونی فرد کے علم میں آجاتا تو ہماری کمپنی کی اقدار پر گہرے سوالات کھڑے ہو سکتے تھے۔ ہماری ٹیم کی کارکردگی متاثر ہو کر خاکستر ہو سکتی تھی، اور اگر کوئی قانونی کارروائی کا دروازہ کھل جاتا تو نہ صرف تمہارے کیریئر بلکہ ہماری کمپنی کی ساکھ پر بھی ایک سیاہ داغ لگ سکتا تھا۔ تمہاری اس حرکت نے یہ واضح کر دیا ہے کہ تمہیں اپنے رویے پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔"

مہتاب صاحب کی آواز میں مایوسی اور غصے کا امتزاج تھا۔ وہ سلمان کو اس کی حرکت کی سنگینی اور اس کے ممکنہ نتائج سے آگاہ کر رہے تھے۔

سلمان نے مہتاب صاحب کی طرف ایک معنی خیز نظر ڈالی اور آہستہ سے کہا، " کیا آپ نے اس بات پر غور کیا ہے اس شخص کی غیر متوقع آمد۔۔۔ آپ کے اندرونی تناؤ کو بڑھانے اور آپ کو پریشان کرنے کی ایک کوشش تھی۔"

اس کی آواز میں ایک عجیب سی لرزش تھی، جیسے وہ کوئی راز کھولنے کو تیار ہو۔

مہتاب صاحب سلمان کی بات سن کر حیران رہ گئے۔ اور گہری سوچ میں پڑ گئے۔

"وہ میرا دشمن نہیں ہے، بیٹا۔ ماضی کے زخموں کو بھول جاؤ، وہ اس کا قصوروار نہیں ہے۔ "مہتاب صاحب کی آواز میں ایک خشک پتے کی طرح لرزتی ہوئی حسرت تھی۔

راحیلہ بیگم خاموشی سے ان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں، سلمان کی آنکھوں میں ایک تلخ سچائی کی جھلک تھی، جیسے کوئی اندھیرا بادل آسمان پر چھا گیا ہو۔

"کیا اس کا یہ قصور نہیں کہ وہ آپ کی بیٹی کے مجرم کا باپ ہے؟"

سلمان نے کم آواز مگر سرد لہجے میں سوال کیا، جیسے برف کی ٹھنڈک کسی کے دل پر پڑ رہی ہو۔

مہتاب صاحب کی خشک آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ زرمین کی یادوں میں کھو گئے، اس کی مسکراہٹ کو اس کی باتوں کو یاد کرنے لگے۔ وہ کبھی نہیں بھول سکتے تھے کہ وہ کس طرح سب کی زندگیوں سے چلی گئی تھی۔ زرمین کی یاد ان کے دل میں ایک گہرا زخم تھی جو ہمیشہ کچا رہتا تھا، فی الحال کوئی کھلا زخم جس پر نمک پاشی کی جا رہی ہو۔

"میری بیٹی نے جو جرم کیا وہ اپنی مجرم آپ تھی۔ "مہتاب صاحب کی آواز میں ایک ایسی مایوسی تھی جیسے کسی بوڑھے درخت کی شاخیں، جنہوں نے زندگی کے ہر موسم کا سامنا کیا ہو، اب تھک ہار کر زمین بوس ہونے کو تیار ہوں۔

"اس کی سوچ تھی، اس کا فیصلہ تھا۔"

سر مشعل کا کالج سے چھٹی کا وقت ہو گیا ہے۔ کاشان نے آگے بڑھ کر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ تو مہتاب صاحب نے جھکی نظروں کے ساتھ سر کو اثبات میں ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے دو قدم آگے بڑھائے۔

سلمان نے مہتاب صاحب کی پشت پر نظریں جمائے آہستہ سے، لیکن پُر اثر انداز میں کہا، " آپ اپنی ایک بیٹی کو تو کھو چکے ہیں کیا اپنی دوسری بیٹی کو بھی کھونا چاہتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو آپ کی زندگی کا کیا بنے گا؟ کیا آپ اس درد کو دوبارہ برداشت کر پائیں گے؟ "

سلمان کے کئی سوال پے در پے کرنے پر مہتاب صاحب کے چہرے پر حیرت کے بادل چھا گئے۔ انہوں بے یقینی کے عالم میں پلٹ کر اس کی سمت دیکھا۔ آواز میں ایک اضطراب سا تھا جب انہوں نے جواب کے بدلے سوال کیا، " کیا مطلب تمھاری اس بات کا؟"

سلمان نے گہری سانس لی اور آہستہ سے بولنا شروع کیا، " وہ آپ سے ملنے مشعل کی خاطر آیا تھا، اس کی آنکھوں میں کیا تھا؟ ہمدردی؟ پچھتاوا؟ یا۔۔۔ " سلمان بولتے ہوئے رک گیا اس کا لہجہ الجھ رہا، چہرے پر کشمکش کے تاثرات اور ایک گہرا افسوس نمایاں تھا۔

"وہ محض ایک بے حس مجسمہ تھا جو ماضی دہرانے کا ذکر چھڑ کر آپ کے دل کے زخموں پر نمک چھڑکنا چاہتا تھا؟"

سلمان نے پھر سے بولنا شروع کیا، اب کی بار اس کی آواز میں تلخیٔ در آئی، اس کے ہونٹ خشک اور دونوں ہاتھ آپس میں مضبوطی سے ایسے پیوست ہو گئے، جیسے وہ کوئی تلخ سچائی بیان کر رہا ہو۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن الفاظ اس کے گلے میں اٹک رہے ہیں۔

سلمان کو خاموشی سے سنتے ہوئے مہتاب صاحب کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔ وہ سلمان کے چہرے کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے وہ اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ راحیلہ بیگم بھی شش و پنج میں مبتلا اُنکے قریب آکر ٹھہر گئی تھیں۔

..☆...☆...☆..

"چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی کلاس سنسان ہو گئی تھی، دھوپ کی کرنیں کھڑکی سے اندر آکر دھول کے ذرات کو ناچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ ایک مشعل ہی تھی جو خالی کلاس میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اب مشعل بھی بیگ باندھ کر کندھے پر لٹکائے دروازے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ علی نے اس کا راستہ روک لیا۔ حیرت زدہ ہونے کے بعد مشعل کو اچانک سب کچھ سمجھ آگیا۔ وہ کیوں یہاں تھا؟ اس نے سوال تک کرنے کی زحمت نہیں گوارا کی۔ علی دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ مشعل جِس طرف جانا چاہتی، وہ اُس طرف حائل ہو جاتا۔ خوفزدہ ہونے کے بجائے مشعل نے ایک گہری سانس لی اور علی کو خونخوار آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"میرا راستہ چھوڑو"

مشعل کا لہجہ بجلی کی طرح چمکا۔ وہ اپنے اندر کے طوفان کو دبانے سے اب عاجز آچکی تھی۔ اس کا چہرہ دہک کر انگارہ ہو گیا تھا، جبکہ ہتھیلیاں پسینے سے نم اور آنکھیں دو شعلوں کی مانند چمک رہی تھیں جو ہر آن پھٹنے کو تیار تھیں۔

"مشعل پلیز ایک بار میری بات۔۔۔"

علی کی باتوں کے پھول ابھی کھلنے سے پہلے ہی، مشعل کے غصے کی آندھی نے انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ایک زوردار تھپڑ نے علی کے چہرے کو سرخ کر دیا۔ وہ حیرت و تعجب سے مشعل کے سپاٹ چہرے کو دیکھتا ہوا وہ اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ اس کے کان اور سنسان کلاس روم میں تھپڑ کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی ابھی تک گونج رہی تھی۔ زناٹے دار تھپڑ کی آواز کے ساتھ ہی علی کا چہرہ لال انگارے کی طرح بھڑک اٹھا تھا۔ درد کی شدت سے اس کی آنکھیں نم ہو کر درد کا آئینہ بن چکی تھیں اور چہرے کے خطوط گہرے ہو گئے تھے۔ وہ درد سے چہرہ مسل رہا تھا۔ تبھی مشعل کے چہرے کے پتھریلے تاثرات دیکھ کر وہ خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔ مشعل چلتی ہوئی کلاس روم کے خراجی دروازے تک پہنچ کر رکی اور پلٹ کر علی کی سمت دیکھتے ہوئے ایک مضبوط لہجے میں بولنے لگی۔

"میں لڑکی ہوں، یہ میری کمزوری نہیں ہے۔ تم جیسے لوگ ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ لڑکیاں کمزور ہوتی ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ میرے والدین نے مجھے سکھایا ہے کہ دنیا ایک جنگل ہے اور اس جنگل میں ہر طرح کے جانور رہتے ہیں۔ کمزور پرندے بھی اس جنگل میں زندہ رہ سکتے ہیں، بس انہیں بہادر ہونا پڑتا ہے۔ کمزور پرندوں کا شکار کرنے والے شکاری ہمیشہ رہیں گے، کیونکہ دنیا کا یہ قانون ہے کہ طاقت ور ہمیشہ کمزور پر ظلم کرتے ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کمزور بھی اپنی حکمت عملی سے طاقتور کو شکست دے سکتے ہیں۔"

مشعل کی آواز میں اتنی قوت تھی کہ سناٹے میں اس کی آواز اور بھی بلند محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنے اندر کی طاقت سے واقف ہے۔

کالج سے نکلتی ہی مشعل کی آنکھوں میں ایک نئی چمک جھلک رہی تھی۔ ہر قدم پر وہ خود کو زیادہ مضبوط محسوس کر رہی تھی۔ مہتاب صاحب گھڑی کی ٹک ٹک کو بے چینی سے سنتے ہوئے بے تابی سے مشعل کا انتظار کر رہے تھے۔ دور سے مشعل کو آتے دیکھ کر

انہیں سانس لینے کی فرصت ملی۔ مشعل کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر انہیں احساس ہوا کہ وہ اب بھی کتنی پیاری اور نازک ہے۔ مشعل گاڑی میں بیٹھ چکی تھی، مگر مہتاب صاحب کے ذہن میں سلمان کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ جبکہ مشعل کی فکر الگ، انہیں چپ چاپ کھائے جا رہی تھی۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

شام کا سورج، لہو کے رنگ میں ڈوبتا ہوا، سلمان کے دل میں ایک اور سورج کو بھی غروب کر رہا تھا۔ وہ لان میں تنہائی کے جزیرے کی طرح بیٹھا تھا، اور اس کی نگاہیں فون کی بے جان روشنی میں کھوئی ہوئی تھیں۔ یکلخت زرمین کی آواز نے اس کے گرد حائل خاموشی کو توڑا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے اندر کیا باتیں چل رہی ہیں؟"

زرمین کی آواز میں اضطراب تھا، اور لہجے میں ایک ایسی تلخی جس نے سلمان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ سلمان نے بے بسی سے سر ہلایا۔

"یہ جانتے ہوئے کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتی، تم پھر بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

زرمین کی آواز میں ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب سلمان کے پاس نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا

" شادی کا وعدہ محبت کا آغاز ہے۔"

" لیکن اسے پورا کرنا زندگی بھر کی جدوجہد ہے۔"

زرمین نے اُسکی بات کاٹ کر تنفر و برا ہمی سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

"مجھے تم سے کبھی محبت نہیں ہو گی۔ نہ اب، نہ شادی کے بعد کبھی۔ اس لیے پیچھے ہٹ جاؤ "

اب کی بار زرمین نے نرم گرم لہجے میں ایسے کہا کہ سلمان کو لگا جیسے وہ کسی زہریلے تیر سے گُلزار ہو گیا ہو۔

"کیوں۔۔۔؟؟ کیا کمی ہے مجھ میں؟ خوبرو نوجوان ہوں، تعلیم یافتہ اور دولت مند بھی ہوں۔ تمہارے پاس کوئی وجہ ہے مجھے ٹھکرا دینے کی؟"

اپنی خوبیاں بتاتے ہوئے سلمان کی آواز میں ایک ایسی مایوسی در تھی، جو اس کی شخصیت کے مضبوط ڈھانچے کو بھی ہلا کر رکھ رہی تھی۔ زرمین نے سلمان کی آنکھوں میں گہرائیوں تک جھانک کر، ایک ایسی نظر سے دیکھا جس میں ہمدردی اور افسوس کی آمیزش تھی۔ مگر اس کی آواز میں ایک نرمی کے ساتھ پختگی بھی تھی۔

"سلمان، تم بہت کچھ ہو، لیکن محبت محض خوبصورت چہرے یا دولت نہیں ہوتی۔ یہ احساسات کا معاملہ ہے، ہاں، میرے پاس ایک بہت بڑی وجہ ہے تمہیں انکار کرنے کی اور وہ یہ کہ میں تم سے نہیں، کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔ "

زرمین کی بے باکی نے سلمان کی عقل مفلوج کر دی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ سمجھدار اور محتاط لڑکی، جو ہمیشہ اپنا ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتی تھی، آج اس قدر بے پرواہ کیوں ہو گئی تھی؟ زرمین کا یہ فیصلہ، جس سے ان دونوں کی زندگیاں تباہ ہو سکتی ہیں، سلمان کے لیے ایک تلخ حقیقت تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس نے کبھی زرمین کو یہ

احساس دلایا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے یا وہ خود اس کی محبت کو سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔

اسی دوران، مشعل چائے کا کپ ہاتھوں میں لیے لان کی طرف آ رہی تھی۔ اس کی گنگناہٹ میں ایک ایسی بے فکری تھی جس پر سلمان کو رشک آ رہا تھا۔

سلمان نے زرمین کی طرف ایک لمحے کے لیے ٹکٹکی لگا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں، جو عام طور پر چمکدار ہوتی تھیں، اب اندھیرے سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک ایسے اندھیرے سے جو اس کے دل میں موجود اضطراب کی گہرائی کو ظاہر کر رہا تھا۔

"تم چاہتی ہو کہ میں انکار کر دوں؟"

سلمان کا لہجہ نرم تھا، لیکن اس نرمی کے پیچھے ہلکی سی لرزش بھی محسوس ہو رہی تھی۔

زرمین نے سر کو آہستگی سے جنبش دیتے ہوئے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پختگی اور یقینی سے کہا،

" میرے خیال سے یہی واحد راستہ ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ایک عزم تھا جو اس کی بات کی تصدیق کر رہا تھا۔

سلمان خاموش رہا۔ وہ زرمین کی آنکھوں میں وہ درد دیکھ سکتا تھا، جو اسے اندر سے کھوکھلا کر رہا تھا۔ " شاید تم خود ہی۔۔۔

اس نے شروع کیا، لیکن زرمین نے اسے روک دیا۔

"میں خود انکار کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں، لیکن میرا انکار، ایک پتھر کی دیوار پر لگنے والی آواز کی طرح، بے اثر اور بے وقعت ہو جائے گا۔ میرا انکار، ایک سناٹے میں ڈوبے ہوئے کمرے میں پکارنے جیسا ہو گا، جہاں میری آواز گم ہو جائے گی، تمہاری آواز میرے لئے ایک امید کی کرن ہے تم میری آواز بن کر پلیز اس رشتے سے انکار کر دو۔ کم از کم تمہاری بات تو ابو سنیں گے ناں۔"

اس کی آواز میں ایک التجا تھی، جو اس کی بے بسی کو ظاہر کر رہی تھی۔

سلمان نے محسوس کیا کہ زرمین اس پر کتنا بوجھ ڈال رہی ہے۔ اس کے دل و دماغ میں ایک زبردست جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ایک طرف اس کی اپنی خوشی تھی اور دوسری طرف زرمین کی تکلیف۔ آخر کار، محبت نے اسے فیصلہ لینے پر مجبور کیا۔

اسے معلوم تھا کہ اس کا یہ فیصلہ اس کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے بدل دے گا، لیکن وہ زرمین کی خوشی کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔

..☆...☆...☆..

):ماضی(

انابیہ کی نگاہیں زرمین پر جمی رہیں جیسے وہ ایک کھوئے ہوئے ستارے کو تلاش کر رہی ہو۔

" زرمین، "اس نے آہستہ سے کہا، " میں تمھارے لیے پریشان ہوں۔ اگر سلمان اس رشتے سے انکار بھی کر دیں، تو تمہیں کیا لگتا ہے، احمر کے لیے تمہارے ابو مان جائیں گے؟ اور کیا احمر تمہارے لیے رشتہ بھی لے کر آئے گا؟ "

انابیہ کی آواز میں ایک گہرا خوف سنائی دے رہا تھا، جیسے وہ ایک طوفان کے آنے کا انتظار کر رہی ہو۔

زرمین نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر اعتماد سے جواب دیا،

"انا، تم کیسا سوچ رہی ہو؟ مجھے یقین ہے سلمان اس رشتے سے انکار کر دے گا اور ابو احمر کے پرپوزل کو بھی انشاء اللہ ضرور قبول کر لیں گے۔ "

اس کے لہجے میں ایک پختہ یقین تھا جو انابیہ کو پریشان کر رہا تھا۔

انابیہ نے اعتراض کیا۔،

"پہلی بات تو یہ کہ مجھے احمر پر بالکل بھی بھروسہ نہیں ہے۔ وہ صرف تمہیں خوش کرنے کے لیے یہ سب کر رہا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہارے لیے کبھی بھی سنجیدہ ہو گا۔ اور اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش بھی کرے تو تمہارے ابو اسے کبھی قبول نہیں کریں گے۔ تمہارے خاندان میں غیر برادری سے شادی کو توہین سمجھا جاتا ہے۔"

زرمین نے اپنی باتوں میں ایک تلخ ذائقہ چھوڑا،

"خاندان والے اس لیے غیروں میں شادی کو اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ جائیداد کسی اور کے ہاتھ نہ لگے۔ گھر کی گھر رہے، یہی ان کی سب سے بڑی فکر ہے۔ ابو چاہے مجھے اپنی ساری جائیداد سے عاق کر دیں، میں احمر سے ہی شادی کروں گی کیونکہ میں اس قفس سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔"

زرمین کی آنکھوں میں ایک بغاوت کی چنگاری تھی، ایک ایسی چنگاری جو روایات کے اندھیرے کو چیر کر روشن ہونا چاہتی تھی۔

انابیہ کی آنکھیں زرمین کی باتوں پر حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے زرمین کی یہ شدت پسندی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔" زرمین، "انابیہ نے آہستہ سے کہا،

"تم ایک شمع کی طرح خود کو جلانا چاہتی ہو۔ کیا تمہیں احساس نہیں کہ احمر تمہیں صرف ایک کھلونا سمجھتا ہے؟ "

انابیہ کی آواز میں ایک گہرا دکھ تھا، جیسے وہ ایک دوست کو اندھیرے گھاٹ میں جاتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔

"احمر کی طرح کے لوگ محبت نہیں کرتے، وہ صرف کھیلتے ہیں۔"

زرمین نے ایک لمحے کے لیے خاموش رہی اور پھر کہا،

" انا، احمر کے بارے میں تمہارے خیالات سراسر غلط ہیں۔ وہ نہایت قابلِ اعتماد اور قابلِ قدر لڑکا ہے۔ "

اس کی آواز میں ایک جذباتی شدت تھی۔

انابیہ نے اس کی طرف دیکھا اور کہا،

" یہ بات میرا دل میں ہمیشہ کھٹکتی رہتی ہے کہ وہ تمہیں کس طرح اپنی طرف مائل کر سکتا تھا؟ "جب کہ ابتدائی دنوں میں تم دونوں کے درمیان کوئی خاص مناسبت تو نظر نہیں آتی تھی۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ کتنی لڑکیوں کے ساتھ اس کے تعلقات ہوا کرتے تھے؟

زرمین نے ایک گہری سانس لی اور نرم لہجے میں بولنا شروع کیا،

"وقت ایک ایسا مظہر ہے جو ہر چیز کو بدل دیتا ہے۔ حالات، سوچ اور نظریات تو پھر اس کے سامنے بے بس ہیں۔ انسان بھی اس کائنات کے ایک ذرہ ہے جو وقت کے قانون سے آزاد نہیں ہے۔

وقت کے ساتھ میری محبت نے اسے بھی بدل دیا ہے۔

اس نے اپنی محبت کا اظہار اس طرح کیا کہ تمام دوسری لڑکیوں کو پس پشت ڈال کر صرف میرے لیے ہی رہ گیا۔

اور یہ ضروری نہیں کہ وہ پہلے کیسا تھا اور اب کیسا ہے؟ ضروری یہ ہے کہ وہ مجھے کیسا لگتا ہے۔

اُس کی صحبت میں مجھے ایک عجیب سا سکون ملتا ہے، میں اس کے ساتھ ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اڑ رہی ہوں۔ دنیا کی تمام پریشانیاں بھول جاتی ہوں۔

وہ مجھے بہت اچھا اور اپنا سا لگتا ہے، انا۔ "

زرمین نے ایک خوابوں سی کیفیت میں کہا۔

"زرمین، تم سمجھ نہیں رہی ہو، "انابیہ نے مایوسی سے کہا۔

" نامحرم کا اچھا اور اپنا سا لگنا، دل کو شیطان کے فریب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ ایک جال ہے جس میں پھنس کر انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے۔ "

انابیہ کی آواز میں درد تھا۔ وہ اپنی دوست کو اس دلدل میں گرتا ہوا دیکھ رہی تھی جس سے نکلنا آسان نہیں تھا۔

..☆...☆...☆..

(حال):

کمرے میں مدھم روشنی کا ایک ہالہ سا بنا ہوا تھا۔ مشعل الماری کو ترتیب دے رہی تھی کہ اچانک اس کے ہاتھ کسی چیز سے ٹکرائے۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹھک گئی، پھر دیکھا تو نیلے رنگ کی مخملی جلد والی ایک ڈائری تھی۔ کس کی ہو سکتی ہے؟ شاید زرمین کی۔

مشعل نے ڈائری کھولی اور اس کے صفحات الٹنے لگی۔ ایک عجیب سی کشش تھی جو اسے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ وہ ڈائری پڑھنے کے لیے ایسے بے چین ہو رہی تھی، جیسے کوئی سرگوشی اسے بلا رہی ہو۔ وہ ڈائری لے کر اسٹڈی ٹیبل پر جا بیٹھی اور ایک گہری سانس لے کر اس کا پہلا صفحہ کھولا۔

پہلے صفحے پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ خالی صفحہ دیکھ کر مشعل کو تھوڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن متجسس ہو کر اس نے اگلا صفحہ کھولا۔ اس صفحے پر کچھ درد بھرے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

:

میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہوں جہاں ذمہ داریاں اور خواہشات ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ ایک طرف، ایک بڑی بہن ہونے کا فرض ہے، ایک ایسا کردار جو ہمیشہ دوسروں کے لیے ایک مثال بننے کا تقاضا کرتا ہے۔ دوسری طرف، ایک ننھی سی خواہش ہے کہ مجھے بھی کبھی پیار سے سمجھایا جائے، میری غلطیوں پر بھی کوئی انگلی نہ اٹھائے۔

میں تھک گئی ہوں، ایک ایسی شخصیت کا لبادہ اوڑھ کر جو ہمیشہ دوسروں کے لیے ایک مضبوط ستون بن کر رہتی ہے۔ دوسروں کی توقعات کے بوجھ تلے، میں اپنی ذات کو کہیں کھو بیٹھی ہوں۔

مشعل، میری چھوٹی بہن، سب کی بہت لاڈلی اور سب کی آنکھوں کا تارا ہے۔ جب وہ کوئی غلطی کرتی ہے تو اسے پیار سے سمجھایا جاتا ہے، کیونکہ وہ ابھی چھوٹی ہے۔ کاش میری

بھی کوئی بڑی بہن ہوتی، یا مشعل مجھ سے بڑی ہوتی، اور میں اسے چھوٹی ہوتی تو میری غلطیوں پر بھی مجھے پیار سے سمجھایا جاتا، شفقت سے نوازا جاتا۔

میں بھی تو انسان ہوں، مجھ سے بھی خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ لیکن میں ان سے سیکھنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے بھی ایک موقع دیا جائے، ایک ایسا ماحول جہاں میں اپنی غلطیوں سے خوفزدہ نہ ہوں، بلکہ ان سے سبق حاصل کروں۔ اگر مجھے بھی پیار اور سمجھداری سے گائیڈ کیا جائے، تو میں بھی ایک بہتر انسان بن سکتی ہوں اور اپنے خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتی ہوں۔

لیکن شاید میری قسمت میں یہ خوشی نہیں ہے۔ میں ایک ایسے مقام پر کھڑی ہوں جہاں میرے قدم تھم سے گئے ہیں۔ ایک جانب ذمہ داریاں ہیں، دوسری جانب آرزوئیں۔ میں بڑی بن بن کر تھک گئی ہوں۔ میں بڑی بن بن کر۔۔۔۔

"

مشعل یہ الفاظ پڑھ کر آبدیدہ ہو گئی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ زرمین کتنی تکلیف میں تھی۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ ڈائری کے ورق پلٹتے ہوئے مشعل زرمین کی دنیا میں کھو سی گئی۔ ہر صفحہ ایک نئی کہانی بیان کر رہا تھا، درد، کسک اور اداسی کی داستان۔ زرمین، جو ہمیشہ ایک مثالی بہن رہی تھی، آج ایک ایسی لڑکی نظر آئی جس کے اندر جذبات کا ایک سمندر موجزن تھا۔ مشعل کو لگا جیسے وہ زرمین کے دل کی باتیں سن رہی ہے۔ وہ ہر لفظ پڑھنا چاہتی تھی، مگر اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ آج وہ زرمین کے دکھوں سے آشنا ہو رہی تھی۔

)فلیش بیک(:

مشعل اور زرمین کے کمرے میں ایک ناگوار حادثہ رُونما ہوا۔ کم سن مشعل، بستر پر کود رہی تھی، زرمین نے منع کیا، لیکن وہ کب سُننے والی تھی؟ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، وہ گری، اور زرمین بھی اسے بچانے کی کوشش میں اپنا توازن کھو بیٹھی۔ دونوں درد سے کراہ رہی تھیں۔

ناہید بیگم، بچوں کی چیخ و پکار سن کر سراسیمہ ہو کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ مشعل کو فرش پر گرا اور زرمین کو اپنا بازو مسلتے دیکھ کر ان کی جان پر بن آئی۔ انہوں نے زرمین کو ڈانٹا کہ وہ بڑی ہو کر بھی مشعل کو نہ سمجھا سکی، حالانکہ وہ خود بھی زخمی تھی۔

زرمین کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ اپنی تکلیف کا اظہار بھی نہ کر سکی۔ اس نے خاموشی سے اپنا بازو دکھایا، جس پر گرنے کی وجہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں۔ ناہید بیگم کا غصہ تو جاتا رہا، لیکن پریشانی برقرار رہی۔ انہوں نے دونوں بیٹیوں کو گلے لگایا اور ان کے زخموں پر مرہم رکھا۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

"احمر میں یہ فون نہیں رکھ سکتی"، زرمین کی آواز ایک ڈوبتے ہوئے ستارے کی طرح فضا میں گونج رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ڈر کی چمک اس کی باتوں سے کہیں زیادہ واضح تھی۔ احمر حیران سارہ گیا۔ " کیوں نہیں رکھ سکتی؟ کیا مسئلہ ہے اس کو رکھنے میں؟ "
زرمین نے سر جھکا لیا، " بس نہیں رکھ سکتی۔ اگر ابو کو پتہ چل گیا تو بہت برا ہو گا۔ ویسے بھی یہ غلط ہے۔ "احمر نے نرم لہجے میں کہا، " ہمارا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اور گھر میں تمہارے رشتے کی باتیں چل رہی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہم یونیورسٹی نہیں آئیں گے تو معلومات دینے کے لیے رکھ لو۔"
یونیورسٹی کا خاموش کونہ، کتابوں کی خوشبو سے لبریز، زرمین اور احمر کی دنیا کا مرکز بن چکا تھا۔ یونیورسٹی کا اختتام قریب تھا اور ان کی محبت کا دریا روز بروز عمیق ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن زرمین کا دل ایک کشمکش کا شکار بھی تھا۔ محبت کا چراغ اس کے دل کو روشنی سے لبریز کرتا تھا، ساتھ ہی خوف کا اندھیرا اس روشنی کو دھندلا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ دونوں احساسات مل کر اسے اندر سے یوں کھوکھلا کر رہے تھے، جیسے ایک کشتی کو دو مخالف سمندروں کی لہریں بے رحمی سے توڑ رہی ہوں۔ احمر کے بغیر زندگی تصور کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ جب احمر نے فون دینے کی کوشش کی تو زرمین نے پہلے انکار کیا لیکن

آخر میں احمر کی بات مان لی اور فون رکھ لیا۔ تحفہ قبول کرتے ہوئے اس کی مسکراہٹ جیسے ایک نقاب تھی، جو اس کے اندر کے طوفان کو چھپا رہی تھی۔

احمر کی نگاہیں زرمین کی روح میں گہرائیوں تک رسائی حاصل کر رہی تھیں، جیسے کوئی تیز دھار چھری نرم موم میں گھس کر اپنا راستہ بنا رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی گہری اور منجمد سی چمک تھی جو زرمین کو پُراسرار دنیا میں لے گئی تھی، جہاں ہر چیز سوالوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ چمک محبت کی شمع نہیں تھی بلکہ ایک ایسا راز تھا جو اندر سے جل رہا تھا، ایک ایسا راز جو محبت کی آگ کو بجھا کر اپنی راکھ سے دھواں اٹھا رہا تھا۔

..☆...☆...☆..

):حال(

"مشعل نے سلمان کی جانب سے معذرت کرتی ہوئی راحیلہ بیگم کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کی۔ بزرگہ خاتون کی آنکھیں نم تھیں، گالوں پر آنسوؤں کے نشانات تھے۔

مشعل نے بے چینی سے پوچھا، 'پھوپھو جان، آپ میری بڑی ہیں، آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟ اور آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں؟'

راحیلہ بیگم نے گہرا سانس لیا اور ایک طویل خاموشی کے بعد بولیں، 'میری آنکھوں میں آنسوؤں کی وجہ میرا سلمان ہے۔ وہ پہلے جیسا نہیں رہا مشعل۔ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی شادی کر دی جائے، لیکن وہ شادی بھی نہیں کرنا چاہ رہا۔ زرمین کے یوں چلے جانے بعد اُس کی زندگی معمول پر نہیں آ رہی۔ میں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔'

مشعل نے راحیلہ بیگم کی باتیں سنیں تو اس کا دل غم سے لبریز ہو گیا۔ اُس نے افسردگی سے کہا، 'پھوپھو جان، آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں ہوں نا۔ مطلب ہم سب ہیں۔ ہم مل کر انہیں پہلے جیسا بنا لیں گے۔'

راحیلہ بیگم نے جواب دیا، 'یہ سب تمہارے کرنے سے ہو گا مشعل، لیکن تم تو اس سے بہت ڈرنے لگی ہو۔'

مشعل نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کا گارڈین اینجل جسے وہ جانتی تھی، جو اسے ہر مصیبت سے پروٹیکٹ کرتا تھا، اب ایک ایسا طوفان بن چکا تھا جس کی موجودگی میں وہ خوفزدہ اور خود کو بے بس محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دوسروں کیلئے محبت اور شفقت نہیں دیکھ پاتی تھی جو پہلے ہوتی تھی۔ سلمان کا یہ روپ اس کے لیے ایک ناقابل فہم پہیلی تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اسے کیسے سمجھا سکتی ہے، کیسے اسے اس اندھیرے سے نکال سکتی ہے۔

..☆...☆...☆..

"سب کی چائے حاضر ہے"، مشعل نے گویا ایک نغمہ الاپتے ہوئے لان میں بیٹھے اپنے والدین اور پھوپھو راحیلہ بیگم کو چائے پیش کی۔ لیکن وہاں ایک خلا تھا، ایک کپ گویا زیادہ تھا۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی، وہ چائے کا کپ سلمان کے لیے تھا، جو اس محفل سے روپوش تھا۔

"مشعل، ذرا سلمان کو چھت پر چائے تو دے آؤ۔ وہ شاید ہم بڑوں کی باتوں سے اُکتا کر اوپر جا بیٹھا ہے۔" ناہید بیگم نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔

مشعل نے ہچکچاتے ہوئے "ٹھیک ہے" کہا اور اپنا اور اس کا کپ اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگی، جیسے کوئی خوابوں کی شہزادی کسی انجانے سفر پر روانہ ہو۔

پیچھے رہ گئی گفتگو کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا، جیسے زندگی کی گاڑی پھر سے چل پڑی ہو۔ رات کی سیاہی چھا چکی تھی، وہ آسمان کی وسعتوں میں کھویا ہوا تھا، جیسے کوئی مسافر کسی انجانے جہان میں بھٹک رہا ہو۔

کسی کی آہٹ پا کر سلمان نے مڑ کر دیکھا۔ تو مشعل کو ہاتھوں میں چائے کا کپ تھامے دیکھ کر اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں، گویا کسی ڈراؤنے خواب کا عکس دیکھ لیا ہو۔ شاید اسے اپنی آفس کی وہ تلخ ملاقات یاد آ گئی جب اس نے سگریٹ نوشی کرتے ہوئے سلمان پر پانی انڈیل دیا تھا۔ آج پھر وہ سگریٹ سلگا رہا تھا، شاید یہی بات اس کی گھبراہٹ کی وجہ بنی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں اور چہرہ دوسری جانب پھیر لیا، جیسے کسی ناگوار یاد سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

مشعل نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور گویا ہوئی، "لیجیے، آپ کی گرما گرم چائے۔" اس نے "گرما گرم" پر خاص زور دیا، جیسے وہ جتلا رہی ہو کہ اس کا کوئی ایسا ارادہ نہیں کہ وہ گرم چائے سے اس کا منہ جھلسائے۔

مشعل کی نگاہیں سلمان کے چہرے پر مرکوز تھیں، ایک عجیب سی کشش، ایک خاموش سی فریاد اس کی نظروں سے عیاں تھی۔ تبھی اس کے ذہن کے پردے پر آج دوپہر اپنی پھوپھو راحیلہ بیگم کے ساتھ ہونے والی گفتگو نے ہلچل مچا دی۔

(خیال):

"میری آنکھوں میں آنسوؤں کی وجہ میرا سلمان ہے۔ وہ پہلے جیسا نہیں رہا مشعل۔ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے۔"

"پھوپھو جان، آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں ہوں نا۔ مطلب ہم سب ہیں۔ ہم مل کر انہیں پہلے جیسا بنا لیں گے۔"

"یہ سب تمہارے کرنے سے ہو گا مشعل، لیکن تم تو اس سے بہت ڈرنے لگی ہو۔"

..☆...☆...☆..

مشعل اور سلمان خاموش رات میں، چھت پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ دور آسمان پر ستارے ٹمٹمار ہے تھے مگر مشعل کی نظریں ان پر نہیں، بلکہ گہری تاریکی میں کھوئی ہوئی تھیں۔

سیاہی کی چادر ہر شے پر پھیل چکی تھی، وقت کی سست رفتار نبض بتاتی تھی کہ رات اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے۔ سلمان نے چائے کا کپ منڈیر پر رکھتے ہوئے، ایک گہری نظر اپنے چاروں اور ڈالی۔ گویا اس خاموش کائنات سے کوئی جواب طلب کر رہا ہو۔

"اندھیرا چھا گیا، کافی رات ہو گئی نہ،" اس نے آہستہ سے کہا۔

"رات کے پاس اندھیرے کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟"

ایک سرگوشی نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔ یہ ایک سوال تھا یا کسی تلخ حقیقت کا بیان، سلمان کے لیے یہ سمجھنا دشوار تھا۔ اس آواز میں ایک عجیب سی بیگانگی تھی، جو دل کو چھو کر گزر گئی۔

مشعل کی استہزائیہ مسکراہٹ نے سلمان کے دل میں ایک ٹیس پیدا کی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی بات میں ایک گہرا طنز پوشیدہ ہے۔ رات تو اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اور اس کا ذکر کرنا محض ایک رسمی بات تھی۔ لیکن مشعل کی نظر میں، یہ ایک بے معنی سی بات تھی۔ کیونکہ مشعل کے نزدیک، رات کی تعریف ہی اندھیرا ہے، اس لیے سلمان کا یہ کہنا کہ "اندھیرا چھا گیا" ایک طرح سے تکرار تھا۔ جب اندھیرا چھا گیا تو ظاہر ہے کہ رات ہو ہی گئی ہو گی۔ اس لیے "کافی رات ہو گئی نہ" کہنا اضافی تھا۔

اب سلمان نے مسکرا کر مشعل کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ مشعل کے اندر ایک روشنی ہے، ایک امید ہے، جو شاید اس وقت تاریکی میں چھپی ہوئی تھی۔

اس نے نرمی سے کہا،

"بہت کچھ ہوتا ہے، جیسے کہ۔۔۔۔

قندیل کی روشنی،

ایک عدد چاند،

خوبصورت یادیں،

اور حسین بچھڑے ہوئے لوگ ستاروں کی مانند۔"

مشعل نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر اداسی سے بولی،

"بظاہر بہت کچھ ہو گا، جیسے کہ قندیل کی لرزتی ہوئی لو، چاند کی مدھم چاندنی، یادوں کے دھندلے نقوش، اور بچھڑے ہوئے ستاروں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی۔ مگر۔۔۔ رات کی سیاہی میں ڈوبے ہوئے منظر، ایک خواب کی مانند مبہم اور دھندلے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کوئی کھویا ہوا گیت ہوا میں تحلیل ہو رہا ہو، یا کسی بچھڑے ہوئے قافلے کا نشان ریت کے ٹیلوں میں کھو گیا ہو۔ قندیل کی لرزتی ہوئی لو، جو کبھی امید کی علامت تھی، اب محض ایک ٹمٹماتا ہوا نقطہ بن کر رہ گئی ہے۔ چاند کی مدھم چاندنی، جو کبھی دلوں کو تسکین بخشتی تھی، اب ایک بے رحم خاموشی میں ڈھل گئی ہے۔

یادوں کے دھندلے نقوش، جو کبھی زندگی کی داستان سناتے تھے، اب ایک گم گشتہ کہانی بن گئے ہیں۔ بچھڑے ہوئے ستاروں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی، جو کبھی رہنمائی کا ذریعہ تھی، اب ایک گم گشتہ راہ کی نشان دہی کرتی ہے۔ مگر۔۔۔ رات کی گہری سیاہی میں، ان تمام نشانیوں کے پیچھے، ایک خوفناک خلا ہے۔ ایک ایسی خاموشی، جو روح کو چیر دیتی ہے۔ ایک ایسا اندھیرا، جو دل کو ڈرا دیتا ہے۔

دھیرے دھیرے دکھوں کے سائے منڈلائیں گے، اور امید کی کرنیں ماند پڑ جائیں گی۔ مایوسی کی چادر اوڑھ کر، غم کے آنسو بہاتے ہوئے، ہم اس رات کی گود میں پناہ لیں گے۔ مگر یہ رات ہمیں کیا دے گی؟ تاریکی کے سوا کچھ نہیں۔ ایک ایسا اندھیرا، جو ہماری روح کو نگل لے گا۔ ایک ایسی خاموشی، جو ہماری آواز کو دبا دے گی۔ ایک ایسا خوف، جو ہماری امید کو ختم کر دے گا۔

رات کے پاس، اندھیرے کے سوا کچھ نہیں بچتا۔"

مشعل نے جو کچھ بھی کہا وہ سلمان کی سوچ کو جانچنے کے لیے کہا تھا۔ اُس کی کوشش دراصل سلمان کو ایک موقع دینا تھا کہ وہ اپنی مثبت سوچ کا ثبوت دے۔

"مشعل،" سلمان نے نرمی سے گویا ہوا، "تم اتنی مایوس اور نااُمید کیوں ہو گئی ہو اور تمہاری سوچ میں یہ اضمحلال کی کیفیت کیوں طاری ہے؟ تم تو خود سراپا نور ہو، تم ایسی باتیں نہیں کر سکتی۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم کن حالات سے گزر رہی ہو، میں تمہاری موجودہ کیفیت سے بھی بخوبی آگاہ ہوں، تمہیں دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں اپنے اندر کے چراغ کو بجھنے نہیں دینا چاہیے۔"

"مشعل،" سلمان نے مشعل کی آنکھوں میں جھانکتے پھر کہا، "تم ایک مضبوط لڑکی ہو۔ تم ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ تمہیں اپنے آپ پر کامل اعتماد ہونا چاہیے۔"

مشعل کی پلکیں بھیگ گئیں۔ وہ سلمان کی روح کی گہرائی سے ناواقف تھی، وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اتنے جانکاہ مصائب جھیلنے کے بعد بھی اس کی مثبت سوچ میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔ اگر اس میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی تو وہ محض اپنی ذات کے لیے تھی۔

اسی آن، مشعل کے اندر ایک انقلاب برپا ہوا، ایک ایسی روشنی چمکی کہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ضیا سے سلمان کے دِل کے اُس گوشے کو منور کرے گی جو مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیروں کی عمیق وادیوں میں گُم تھا۔

..☆...☆...☆..

(زرمین کی ڈائری):

" کبھی کبھار میں سوچتی ہوں کہ ادھوری کہانیاں ہی امر کیوں ہوتی ہیں، جن کو منزل نہیں ملتی؟ شاید اس لیے کہ مکمل کہانیاں ایک قصہ بن جاتی ہیں، ایک ایسی داستان جو شروع ہوتی ہے، پروان چڑھتی ہے اور ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ادھوری کہانیاں ایک خواب بن جاتی ہیں، ایک ایسی خواہش جو کبھی پوری نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جو ہمیشہ جلتی رہتی ہے، ایک ایسی کسک جو ہمیشہ دل میں رہتی ہے۔

ادھوری کہانیاں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ زندگی کتنی مختصر ہے، اور محبت کتنی قیمتی۔ یہ ہمیں سکھاتی ہیں کہ ہمیں ہر لمحے کو جینا چاہیے، اور ہر رشتے کو قدر کرنی چاہیے۔ یہ ہمیں بتاتی ہیں کہ محبت صرف جسموں کا ملن نہیں، بلکہ روحوں کا ایک تعلق ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ادھوری کہانیاں امر ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں، ایک ایسی یاد جو کبھی نہیں مٹتی۔ وہ ہمیں ایک ایسی کائنات سے جوڑتی ہیں جو وقت اور جگہ کی قید سے آزاد ہے۔"

..☆...☆...☆..

(ماضی):

"وہ سب مجھے کس طرح تنہا چھوڑ کر جاسکتے ہیں؟" زرمین کی روح کانپ رہی تھی، اس کی آواز میں ایک لرزش تھی جو دل کو چھو رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں میں اتنی چھوٹی نہیں ہوں کہ اکیلی نہ رہ سکوں، لیکن یہ تنہائی، یہ سکوت، یہ مجھے ڈراتا ہے۔ میں اس ویرانی سے خوفزدہ ہوں۔"

احمر نے فون پر اس کی رونی آواز سنی تو اس کا دل دکھ گیا۔ وہ زرمین کے ہر وقت رونے کی عادت سے اکتا چکا تھا، لیکن پھر بھی اس کی پریشانی نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"سب کہاں گئے ہیں؟ مطلب تمہیں اکیلا چھوڑ کر کہاں جاسکتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"پھوپھو کے گھر جا رہے ہیں۔" زرمین نے جواب دیا، اس کی آواز ابھی بھی لرز رہی تھی۔

"ابو چاہتے تھے کہ میں گھر پر ہی رہوں۔ مشعل کو بھی میرے ساتھ ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ بھی ضد کر کے ان کے ساتھ جا رہی ہے۔"

اس بار نے زرمین باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

"لیکن تم اکیلی کہاں ہو؟ میں تو ہوں تمہارے ساتھ،" احمر نے کہا، اس کی آواز میں ایک تسلی تھی، ایک اپنائیت تھی۔

زرمین احمر کی بات پر گھبرا گئی، اس کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ جب تک تمہارے گھر والے واپس نہیں آجاتے، ہم یوں ہی باتیں کرتے رہیں گے۔"

احمر کی بات سن کر زرمین نے جیسے سکون کا سانس لیا بر محل وہ کچھ اور سمجھی تھی۔

"لیکن تمہیں تو ہسپتال جانا ہے نا؟ تمہارے ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"جانا تو ہے، لیکن۔۔۔"

"لیکن کچھ نہیں، تم چلے جاؤ۔ میں رہ لوں گی۔"

"سچ میں؟" احمر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں، سچ میں۔ میں رہ لوں گی۔" زرمین جواباً مسکرا کر کہا۔

"چلو، ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کب نکل رہے ہیں وہ لوگ؟" احمر نے ایک ائی برو اچکا کر بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"بس کچھ ہی دیر میں،" زرمین نے افسردگی سے کہا۔

"اچھا سنو، دروازے اچھی طرح بند کر کے رکھنا اور اگر ڈر لگے تو ٹی وی وغیرہ دیکھ لینا۔"

"تم جانتے ہو احمر ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔" زرمین نے روہانسی آواز میں کہا۔ جیسے وہ دوبارہ رونے لگی ہو۔

"چلو کوئی بات نہیں، فون تو ہے نا تمہارے پاس؟ اس پر کچھ دیکھ لینا۔"

"تم بہت اچھے ہو احمر۔ تم میرا بہت خیال رکھتے ہو۔ تھینک یو سو مچ۔"

"یہ تو میرا فرض ہے،" احمر نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا، میں چلتی ہوں۔ سب کو سی آف کر آؤں۔ بائے۔"

"ٹھیک ہے، بائے۔" احمر نے فون بند کیا تو اس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اسے پتہ تھا کہ کب کیا کرنا ہے۔

..☆...☆...☆...

"کیا ہوا؟ گاڑی ٹھیک تو ہے نا؟" کئی بار گاڑی سٹارٹ کرنے کے بعد جب وہ سٹارٹ نہ ہوئی تو ناہید بیگم نے مہتاب صاحب سے پوچھا۔

"نہیں، پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے۔ رکو، میں دیکھتا ہوں۔" مہتاب صاحب کہتے ہوئے گاڑی سے باہر آئے۔

مہتاب صاحب کافی دیر تک بونٹ کھول کر دیکھتے رہے، لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔

"ایسا کریں، مکینک کو گھر بلوا لیں۔ اتنا ضروری نہیں ہے آج جانا۔ پھر کسی دن چلے جائیں گے۔" کافی دیر تک جب وہ مسئلہ سمجھ میں نہ آیا تو ناہید بیگم نے کہا۔ تو مہتاب صاحب کو بھی یہی مناسب لگا۔

اب مکینک کو گھر بلایا گیا۔ وہ گاڑی سٹارٹ کر کے ورکشاپ لے گیا۔

جانے کا ارادہ آج کے دن کے لیے ملتوی ہو گیا۔

زرمین احمر کو بتانا چاہتی تھی، لیکن اس نے سوچا کہ وہ اپنے دوست کے پاس ہسپتال میں ہو گا۔ ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لگا۔

~~~~~~~
~~~~~~~

رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور مہتاب صاحب اپنے لان میں ٹہل رہے تھے۔ اچانک انہیں ایک سایہ دیوار پھلانگتا ہوا محسوس ہوا۔ "کون ہے وہاں؟" انہوں نے گرجدار آواز میں پوچھا۔ سایہ مڑ کر دیوار واپس پھلانگنے لگا، لیکن مہتاب صاحب نے اسے پکڑ لیا۔ "چور۔۔۔چوکیدار۔۔۔چوکیدار جلدی آؤ!" انہوں نے زور سے آواز لگائی۔ چوکیدار کی مدد سے چور کو قابو کر لیا گیا۔ شور سن کر گھر کے سب افراد باہر نکل آئے۔ چور مسلسل "چھوڑیں مجھے۔۔۔چھوڑیں" کی دہائیاں دے رہا تھا۔

زرمین نے جیسے ہی چور کی آواز سنی، وہ چونک گئی۔ پھر جب اس نے چہرے پر پڑتی چاندنی میں اس کا خاکہ دیکھا تو اس کے قدم رک گئے۔ یہ احمر تھا! اس کی حالت زار دیکھ کر زرمین کے ہوش اڑ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی زندہ لاش ہو۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، اور جسم کانپ رہا تھا۔

"زرمین۔۔۔ان کو بتاؤ کہ میں چور نہیں ہوں۔" احمر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ وہ خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، لیکن مہتاب صاحب اور چوکیدار نے اسے مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔ احمر کی التجا سن کر زرمین پر ایک لمحے کے لئے سکتہ طاری ہو گیا۔

رات ظالم بنی وقت جیسے تھم سا گیا۔ سب نے احمر سے نظریں ہٹا کر زرمین پر جما لیں۔

احمر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "انکل، آپ کی بیٹی نے بلایا ہے مجھے۔ کہہ رہی تھی کہ سب لوگ پھوپھو کی طرف جا رہے ہیں۔" اس کی آواز میں ایک عجیب سی بے بسی تھی۔ وہ اپنی بات سے سب کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

(خیال):

"یار، یہ زرمین واقعی میں کوئی چیز ہے،" احمر نے حماد سے کہا، دونوں کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ "تم نے سچ کہا تھا، بالکل مشرقی اور روایتی۔"

حماد نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "ہاں بالکل، زرمین کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ باہر سے جتنی خاموش اور سیدھی لگتی ہے، اندر سے اتنی ہی تُند اور تیز ہے۔"

احمر نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا اور پھر پوچھا، "تو کیا لگتا ہے، پٹ جائے گی؟"

حماد ہنسا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے؟ جو لڑکی سب کے سامنے تمہیں دن میں تارے دکھا سکتی ہے، وہ اتنی آسانی سے پٹنے والی ہے؟"

احمر نے ایک لمحے کے لئے سوچا، پھر کہا، "چیلنج تو ہے۔ لیکن مجھے چیلنجز پسند ہیں۔"

حماد نے کندھے اچکائے۔ "تمہاری مرضی۔ لیکن یاد رکھنا، زرمین سے پنگا لینا آسان نہیں ہے۔ وہ تمہیں تمہاری اوقات دکھا سکتی ہے۔"

احمر نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "دیکھ لیں گے۔ ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔"

حماد نے سر ہلایا اور کہا، "مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں یہ پارٹی تمہارے اوپر ہی نہ بھاری پڑ جائے۔"

احمر نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اتنی فکر نہ کرو یار، میں نے ایسے بہت سی زرمینیں دیکھی ہیں۔"

حماد نے ایک گہری سانس لی اور کہا، "تم نہیں سمجھے، احمر۔ زرمین ان سب سے الگ ہے۔ وہ ایک آگ ہے، اور جو اس سے کھیلتا ہے، وہ جل جاتا ہے۔"

احمر نے حماد کی بات سنی، لیکن اس کے چہرے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اب بھی پُرعزم تھا۔ اس نے زرمین کو فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

..☆...✯...☆..

زرمین کو اپنے ہی گھر والوں کی نظروں میں مشکوک دیکھ کر احمر کو پوری یونیورسٹی کے سامنے زرمین کے ہاتھوں اپنی رسوائی کا منظر یاد آ گیا۔ ایک تلخ ہنسی اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

"زری، تم نے تو کہا تھا کہ سب لوگ تمہاری پھوپھو کی طرف جا رہے ہیں؟ تم نے جھوٹ بولا تھا؟ مجھے پھنسوانا چاہتی تھی تم؟" احمر نے پے در پے الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کی آواز میں غصہ، مایوسی اور انتقام کی ایک کسک تھی۔

"ابو۔۔۔ ابو۔۔۔ یہ جھوٹ۔۔۔ جھو۔۔۔ جھوٹ۔۔۔ اللہ کی قسم۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں۔۔۔" زرمین کے الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے۔ اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں اور چہرہ فق پڑ گیا تھا۔ اس کے دل پر جیسے کوہِ غم ٹوٹ پڑا تھا۔

ایسا دھوکہ، اتنا بڑا دھوکہ۔ یہ سوچ کر ہی اس کا وجود لرز اٹھا۔

"زرمین۔۔۔" ناہید بیگم نے جیسے بے یقینی اور حیرت کے عالم میں اس کا نام لیا۔ ان کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔ کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟

"نہیں امی۔۔۔ میں نہیں۔۔۔" زرمین نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاہتی تھی، لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ اس وقت ایک ایسی کیفیت سے دوچار تھی جہاں سچ اور جھوٹ کے درمیان ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔

(خیال):

احمر کو اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ کر زرمین کے ماتھے پر ناگواری کے بل پڑ گئے۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں اور جبڑے بھینچ گئے۔ اس نے اپنی سہیلیوں کو ایک نظر دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لی۔

"زری، میری بات۔۔۔" احمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا۔

زرمین نے ایک لمحے کے لئے احمر کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا۔ تھپڑ کی گونج پورے کیفٹیریا میں سنائی دی۔

تھپڑ مارتے وقت زرمین کی آنکھیں غصے سے چمک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے غصے اور حقارت کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے۔

تھپڑ مارنے کے بعد زرمین نے اپنی انگلی احمر کی جانب اٹھائی اور کہا،

"زرمین۔۔۔ زرمین مہتاب کو ہاتھ لگانے کی ہمت بھی کیسے کی تم نے، ہاں؟" اس کی آواز میں ایک تند سی تیزی تھی۔

زرمین کے اس عمل سے احمر بالکل سکتے میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا ردعمل ظاہر کرے۔

زرمین کا یہ عمل نہ صرف احمر کے لئے ایک سرپرائز تھا بلکہ وہاں موجود تمام لوگوں کے لئے بھی ایک حیران کن منظر تھا۔

..☆...☆...☆..

"احمر نے اپنا انتقام تو لے لیا تھا، لیکن اس کے دل میں ایک خالی پن تھا۔ وہ خاموشی سے گھر سے نکل گیا، کسی کو پرواہ نہیں تھی کہ وہ گیا یا نہیں، کسی نے اسے روکا تک نہیں۔"

:

"ابو۔۔۔۔! خدا کے لیے میری بات سنیے! میں نے اسے نہیں بلایا۔ یہ سچ ہے کہ میں اس سے بات کرتی تھی، لیکن ابو! آپ کی بیٹی اتنی گری ہوئی نہیں ہو سکتی۔ ابو! میں نے اسے نہیں بلایا۔" زرمین کی آواز لرز رہی تھی اور آنسوؤں کی جھڑی لگاتار بہہ رہی تھی۔ اِسی اثناء میں، اس کی پیشانی مہتاب صاحب کے قدموں سے مس ہوئی، گویا کوئی پشیمان روح، اپنی لغزشوں کی تلافی کے لیے، عاجزی کی انتہا کو چھو رہی ہو۔

مہتاب صاحب ساکت و جامد کھڑے تھے، ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ زرمین کی التجا ان کے دل پر کوئی اثر نہیں کر رہی تھی۔ وہ بالکل پتھر کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔

"ابو! میری طرف دیکھیے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ ابو! یہ جو کچھ بھی آپ دیکھ رہے ہیں، یہ سب ایک فریب ہے۔ ابو! خدا کے لیے مجھ پر یقین کریں۔" زرمین نے مہتاب صاحب کے پیروں کو تھام لیا، جیسے ڈوبنے والا شخص کسی تنکے کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن مہتاب صاحب نے اسے جھٹک دیا اور اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے گھر کا تماشا باہر والوں کے سامنے لگے۔ زرمین پیچھے رہ گئی، اس کی چیخیں اور آہیں کمرے کے بند دروازے سے ٹکرا کر واپس لوٹ آئیں۔ وہ بے بسی اور ناامیدی کے عالم میں فرش پر گر پڑی، اس کی التجا اور فریادیں بے سود ثابت ہوئیں۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

"آپی۔۔۔!!ہم ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں۔" مشعل نے آسمان پر نظر جمائے ہوئے، ایک امید بھری مسکراہٹ کے ساتھ نرمی سے کہا۔

مشعل اور زرمین کی گفتگو ایک ایسے موڑ پر آ پہنچی تھی جہاں خاموشی بھی ایک زبان بن گئی تھی۔ مشعل کی نظریں آسمان پر جمی تھیں اور اس کی سوچیں بھی وہیں کہیں کھوئی ہوئی تھیں۔

"آپ کو پتہ ہے آپی، یہ آسمان بالکل ہماری زندگی کی طرح ہے۔" مشعل نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مطلب؟" زرمین نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھیں، یہ جو تارے ہیں نا، یہ ہماری زندگی میں آنے والے لوگ ہیں۔ کچھ دوست، کچھ رشتے دار، کچھ محض جاننے والے۔ ان میں سے کچھ ستارے بہت روشن ہوتے ہیں، کچھ مدھم۔ کچھ ہمیں راستہ دکھاتے ہیں، کچھ بس ہمارے ساتھ چلتے ہیں۔"

"اور چاند۔۔۔" مشعل کی بات کاٹتے ہوئے زرمین نے گویا ایک خوابوں کی وادی میں قدم رکھا۔

"چاند... چاند وہ خاص شخص ہے جو ہماری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ہماری محبت، ہمارا خواب، ہماری امید ہے۔ چاند ایک ہی ہوتا ہے، لیکن اس کی روشنی سے ہی یہ سارے تارے بھی چمکتے ہیں۔"

زرمین نے اس بار اپنے قلب سے احمر کی یاد کو یوں جھٹک دیا، جیسے کوئی پرندہ اپنے پروں سے گرد جھٹکتا ہے۔ اور سلمان کو اس نے چاند کی مانند پایا، جو اپنی ضیا سے اس کے دل کو منور کر رہا تھا۔ وہ احمر، جس کے لیے کبھی اس نے سلمان کو چھوڑ دیا تھا، اور جس نے اسے محبت کے فریب سے دوچار کیا تھا۔ اب وہ اپنی زندگی کے اس دوراہے پر کھڑی تھی، جہاں اسے احساس ہوا کہ اس نے سلمان کو کس قدر غلط سمجھا تھا۔ وہ گمان کرتی تھی کہ

سلمان بھی اس کے باپ کی طرح اصول پرست، سخت گیر اور عورتوں پر پابندیاں عائد کرنے والا شخص ہے۔ اس لیے وہ اس کی قید میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ زرمین نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر وہ ایسا ہوتا تو وہ کبھی احمر سے محبت کا اقرار اس کے سامنے کرنے کی جرأت نہ کرتی۔ لیکن اب اس پر عیاں ہوا کہ وہ اپنی سوچ میں کس قدر غلطی پر تھی۔ اسے ادراک ہوا کہ محبت کی وادیوں میں گمان کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب وہ جان چکی تھی کہ سچی محبت تو بصیرت اور یقین کی مُحتاج ہوتی ہے۔

مشعل نے ایک لمحے کے لیے سانس لیا اور پھر کہا،

"لیکن آپی، یہ تارے بھی تو کتنے اہم ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو آسمان کتنا خالی خالی سا لگے گا۔ بالکل ایسے ہی جیسے اگر ہماری زندگی میں لوگ نہ ہوں تو ہماری زندگی بھی کتنی بے معنی سی ہو جائے۔"

زرمین خاموش تھی، لیکن اس کی آنکھیں مشعل کی باتوں کی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"آپی۔۔۔!! ہمیں ان تاروں کی قدر کرنی چاہیے۔ ان کی روشنی سے ہی ہماری زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔ اور چاند کی محبت کو بھی ہمیشہ اپنے دل میں زندہ رکھنا چاہیے۔"

مشعل نے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

"زندگی ایک آسمان ہے، لوگ تارے ہیں اور محبت چاند۔ ہمیں اپنی زندگی کے آسمان کو تاروں سے سجانا ہے اور چاند کی روشنی سے منور کرنا ہے۔"

"آپ کو سلمان بھائی سے شادی کر لینی چاہیے، وہ آپ کو دل سے چاہتے ہیں اور وہ کسی بھی وقت آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"سلمان بجا طور پر ایک چاند ہے، اور میں ایک ٹوٹا ہوا تارا، میں اس کے قابل نہیں رہی مشعل۔" زرمین کے لہجے میں ایک دنیا کا پچھتاوا تھا۔ احمر کے دھوکے نے اسے اندر سے توڑ دیا تھا۔ وہ سلمان کی محبت کی قدر اب جان چکی تھی، لیکن شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔

زرمین نے اپنی جگہ سے اٹھ کر، اشکبار آنکھوں سے چاند کی جانب دیکھا۔ ایک گہری ندامت نے اس کے وجود کو گھیر لیا تھا۔ وہ شکستہ قدموں سے کمرے کے اندر چلی گئی، اس کے پیچھے مشعل کھڑی رہی۔

مشعل نے زرمین کی بات سنی تو اس کا دل بھر آیا۔ وہ جانتی تھی کہ زرمین کے دل میں کتنا درد ہے۔

AESTHETIC NOVELS
EXPLORE, DREAM AND READ
IG:AESTHETICNOVELS.ONLINE

AESTHETIC NOVELS
EXPLORE, DREAM AND READ
IG:AESTHETICNOVELS.ONLINE

قسط نمبر 3

(ماضی):

زرمین، تنہائی کی گہری وادی میں، فرشِ خاک پر دوزانو بیٹھی تھی، آنسوؤں کی موسلا دھار بارش سے اس کا دامن تر تھا۔ اس کی روح، جان لیوا صدمے کے آتش فشاں سے مضمحل،

سسکیوں کے لاوے اگل رہی تھی۔ دور کھڑی مشعل، حواس باختہ، اس منظرِ کرب کو سمجھنے کی لاحاصل کوشش میں مبتلا تھی۔

"مشعل، میں سچ کہہ رہی ہوں،"

زرمین نے ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان، بمشکل الفاظ کو جوڑتے ہوئے التجا کی،

"میرا یقین کرو، میں نے اسے نہیں بلایا۔ خدا گواہ ہے، میں نے اسے نہیں بلایا۔ وہ خود آیا تھا، مشعل۔ میں نے اسے نہیں بلایا۔"

مشعل، زرمین کی دل گرفتگی کو محسوس کرتے ہوئے، سرعت سے اس کی طرف بڑھی اور اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر، اسے زمین سے اٹھنے میں سہارا دینے لگی۔

"جانتی ہوں آپی! آپ نے اسے نہیں بلایا،"

مشعل نے زرمین کے سر سے اتری چادر درست کی اور اس کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے انگوٹھوں سے پونچھتے ہوئے، رندھی ہوئی آواز میں ملائمت سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اُٹھتے ہی زرمین کی متورم نگاہیں نیم وا دروازے کی اوٹ سے معراج صاحب کے گھر کے سامنے رُکی گاڑی سے اُترتی انابیہ کے چہرے پر پڑیں، جو بے تاثر پتھر کی مانند ساکت تھا، جیسے کسی گہرے بھید کو چھپائے ہوئے ہو۔ انابیہ کی نظریں، احمر کی پشت کو کسی لاینحل معمہ کی طرح تکتے ہوئے، بار بار گھر کے اندر جھانک رہی تھی، جیسے کوئی پوشیدہ راز تلاش کر رہی ہو۔

رسوائی کے خدشے کی سیاہی زرمین کے چہرے پر بکھرتی گئی اور کئی سوالات بیک وقت اس کے ذہن میں یلغار کرنے لگے۔

بے ساختہ مشعل کے بازوؤں کی نرم گرفت سے خود کو آزاد کروا کر، وہ اشکوں کے سیلاب میں بہتے ہوئے، اندر کی سمت دیوانہ وار لپکی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر، اس نے

دروازہ وحشیانہ قوت سے بند کیا، گویا دنیا سے اپنے تمام رشتے منقطع کر رہی ہو۔ اب دروازے سے پشت ٹکا کر، وہ وقت کے بے رحم ہاتھوں میں پڑی ہوئی شکستہ گڑیا کی طرح بے حس و حرکت کھڑی رہی، پھر آہستہ آہستہ زمین پر ڈھیر ہوتی چلی گئی۔

اس کی روح پارہ پارہ ہو گئی تھی، اور اس کی پلکوں سے ٹپکتے آنسو زہرِ قاتل کا روپ دھار چکے تھے۔ دروازے کی گونج، اس کے کربِ جاں کی چیخ اور اس کے بکھرتے خوابوں کا مرثیہ بن گئی۔ وہ شکستہ گڑیا زمین پر سمٹ گئی، اس کا وجود تار تار ہو چکا تھا۔ اس کی سسکیاں کمرے کی خاموش فضا میں گونج رہی تھیں، اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھتے ہوئے درد کی گواہی دے رہی تھیں۔

پوری رات وہ روتی رہی تھی۔ اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا، محبت کی آرزو، توجہ اور سنے جانے کی تمنا میں اس سے کتنی بڑی غلطی ہو گئی تھی، بلکہ گناہ، ایسا گناہ جس کا خسارہ تمام عمر باقی رہنا تھا، ایک ایسا گناہ جس کا کفارہ اُسے اب اپنی ہر سانس کے ساتھ ادا کرنا تھا۔ ایک ایسا گناہ جسے معاشرہ کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے احمر کا دیا ہوا موبائل توڑ دیا، سم نکال کر ٹکڑے کر دی اور پھر آنسو پونچھ کر بیٹھ گئی تھی، یہ سوچنے کے لیے کہ یہ سب کیا ہو گیا، کیسے ہو گیا۔

..☆...☆...☆..

صبح کی روشنی بھی اس کے وجود کی تھرتھراہٹ کو نہ مٹا سکی۔ وہ ایک ایسے ویرانے میں کھڑی تھی جہاں اس کا سایہ بھی اس سے روٹھ گیا تھا۔

اس نے محبت کے سراب میں اپنا سب کچھ گنوا دیا تھا۔ اس کی روح پر لگے زخم اتنا گہرا تھا کہ ان کا مندمل ہونا ناممکن تھا۔ وہ ایک ایسی قیدی بن چکی تھی جس کے ہاتھوں میں رسیاں نہیں، ضمیر کی زنجیریں تھیں۔ وہ خود کو ملامت کر رہی تھی، اس نے اپنی معصومیت کو داغدار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ندامت اور پچھتاوے کے آنسو تھے جو اس کی روح کو دھو رہے تھے۔

گھر کی در و دیوار بھی اس کی ذات سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ وہ کمرے کی چار دیواری میں یوں مقید تھی جیسے کسی تاریک غار میں صدیوں سے قید کوئی روح ہو۔ اس نے اپنی تقدیر کی وہ لکیر پار کر لی تھی جہاں سے واپسی کا کوئی تصور بھی محال تھا۔ وہ ایک ایسے تاریک مستقبل میں جا کھڑی ہوئی تھی جس کی تنہائی میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا تھا۔

..☆...☆...☆..

(حال):

سوفٹ بورڈ پر رزلٹ شیٹ دیکھ کر مشعل کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ارد گرد طالبات کا ہجوم اسے مبارکباد دے رہا تھا۔ آرزو اور نائلہ، اس کی قریبی سہیلیاں، اس کی شاندار کامیابی پر فخر سے سرشار تھیں اور اسے دل سے شاباشی دے رہی تھیں۔ ہوا میں خوشی اور مسرت کی ملی جلی مہک پھیلی ہوئی تھی، جو ان نوجوان دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ تھی۔ رزلٹ شیٹ پر درج اعداد و شمار صرف نمبر نہیں تھے، بلکہ مشعل کی انتھک محنت، لگن اور عزم کی گواہی تھے۔ اس لمحے، مشعل نے اپنے آپ کو کامیابی کی بلندیوں پر

محسوس کیا، جہاں سے اسے اپنا مستقبل روشن اور تابناک نظر آ رہا تھا۔ یہ صرف ایک امتحان کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اس کی زندگی کا ایک اہم سنگ میل تھا، جو اسے مزید آگے بڑھنے اور اپنے خوابوں کو پورا کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔

...

"اوئے ہوئے! کنگریچولیشنز، کنگریچولیشنز! شکر ہے بھئی، تم نے ٹاپ کر لیا، ورنہ ہمیں اس کے اور نخرے اٹھانے پڑتے۔"

آرزو نے نائلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شرارت سے چھیڑتے ہوئے کہا اور دونوں بیک وقت پرجوش انداز میں مشعل سے گلے ملیں۔

"مشعل مہتاب کے ہوتے ہوئے کوئی اور ٹاپ کر سکتا ہے بھلا؟ یہ تمہاری محنت اور ضد کا بیسٹ رزلٹ ہے۔"

نائلہ نے آرزو کی طرف دیکھتے ہوئے مشعل سے کہا، جو ابھی تک بڑی دلچسپی سے سوفٹ بورڈ پر لگی رزلٹ شیٹ کو دیکھ رہی تھی۔

"اور ہاں، کنگریچولیشنز فار ٹاپنگ یور لاء ایگزامز! اب تو پارٹیاں بنتی ہیں۔"

آرزو نے مزید جوش و خروش سے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹریٹ میری طرف سے۔"

مشعل نے مسکراتے ہوئے کہا،

"لیکن یونیورسٹی کے اندر ہی، باہر نہیں!"

"ہاں یار، ہمیں پتا ہے،" آرزو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"انکل کے رولز تمہارے لیے صرف رولز نہیں، بلکہ تمہارا اسٹائل سٹیٹمنٹ ہیں، تم باہر جا کر ان کو کیسے ڈسٹرب کر سکتی ہو؟"

"کوئی بات نہیں، یونیورسٹی میں بھی پارٹی کم نہیں ہو گی۔"

نائلہ نے مشعل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کیفے ٹیریا کی طرف بڑھ رہی تھی، جہاں وہ اپنی کامیابی کا جشن منانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

کیفے ٹیریا کی سمت بڑھتے قدموں کے ساتھ اس کے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ گھر جا کر اپنی کامیابی کا اعلان کیسے کرے گی۔ وہ اپنے ابو کو سرپرائز دینا چاہتی تھی، وہ بخوبی جانتی تھی کہ انہیں خوش کرنے کے لیے اسے ایک خاص انداز اپنانا ہو گا۔ وہ مہتاب صاحب کے سخت اصولوں کا احترام کرتی تھی، لیکن وہ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس کی کامیابی پر فخر محسوس کریں گے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر جا کر

خاص اپنے ہاتھوں سے ان کا پسندیدہ کھانا بنائے گی پھر اپنی کامیابی کا اعلان کرے گی۔

...

کیفے ٹیریا میں داخل ہوتے ہی مشعل نے دیکھا کہ اس کی دیگر دوستیں بھی وہاں موجود ہیں۔ جنہوں نے پرجوش تالیوں سے اسکا استقبال کیا۔ ان کی آنکھوں میں چمک اور چہروں پر مسرت عیاں تھی۔ مشعل نے دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ ان کی محبتوں میں مزید محو ہوتی، آسمان پر ناگہاں گھرے بادل نمودار ہوئے، گویا کسی نے سیاہی کا پردہ کھینچ دیا ہو۔ پھر، دیکھتے ہی دیکھتے، موسلا دھار بارش نے طوفانی صورت اختیار کر لی۔

"اوہ، نہیں!" طلباء کے چہروں پر یکدم پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔

ابھی بارش کا آغاز ہی ہوا تھا، مگر گرج چمک کے طوفان اور تند و تیز ہواؤں نے ماحول کو مزید خوفناک بنا دیا۔ طلباء سراسیمگی کے عالم میں اپنے گھروں کی طرف لپکے، لیکن مشعل، آرزو اور نائلہ وہیں ساکت کھڑی رہ گئیں۔

"اب کیا کریں؟" مشعل نے پریشانی سے آرزو کی طرف دیکھا۔

دوسری طرف، مہتاب صاحب ایک اہم بزنس میٹنگ میں مصروف تھے، لیکن جیسے ہی انہیں موسم کی خرابی اور مشعل کی حفاظت کا خیال آیا، ان کی تمام تر توجہ بٹ گئی۔ انہیں مشعل کی فکر نے گھیر لیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہیں رک سکے اور فوراً یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کی ترجیحات ہمیشہ واضح تھیں: مشعل کی حفاظت سب سے مقدم تھی۔

"تم میرے فون سے اپنے ابو کو کال کر لو۔"

آرزو نے اپنا موبائل مشعل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ان کا نمبر تو زبانی یاد ہی ہے۔"

"ہاں، شکریہ!"

مشعل نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فون لیا اور مہتاب صاحب کو کال ملانے لگی۔ بار بار کی کوشش کے باوجود کال مل نہیں رہی تھی۔

"لگتا ہے ابو مصروف ہیں،" مشعل نے مایوسی سے کہا۔ "فون نہیں اٹھا رہے۔"

وہ آرزو یا نائلہ کے ساتھ گھر بھی نہیں جا سکتی تھی، اس لئے وہ دونوں اس کے ساتھ بادلِ نخواستہ مہتاب صاحب کا انتظار کرنے لگیں جبکہ خود ان کے گھر سے بار بار کالز بھی آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر میں مہتاب صاحب بری طرح بھیگتے ہوئے یونی ورسٹی کے دروازے پر کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر ان تینوں کے چہروں پر خوشی اُمڈ آئی۔ وہ بخوبی ہمیشہ اپنی ذمہ داری نبھانا جانتے تھے۔ اب وہ مشعل کی طرف لپکے اور اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے اس کی سہیلیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مشعل کو جلدی چلنے کا کہہ رہے تھے۔

..☆...☆...☆..

گھر کی دہلیز پار کرتے ہی مشعل نے گہری سانس لی۔ آج کا دن کتنا غیر معمولی تھا! رزلٹ کے وقت تیز ہوتی دھڑکن، بارش کے وقت انتظار،... اور اب، گھر والوں کو خوشخبری سنانے کی باری تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی، جہاں ناہید بیگم مضطرب ہو کر چائے بنا رہی تھیں۔ ان کی پیشانی پر فکر کی ہلکی لکیریں تھیں۔

"امی!" مشعل نے جوش سے کہا، "آج میرا رزلٹ آیا تھا۔"

ناہید بیگم نے چونک کر دیکھا،

"تم آگئی!؟"

ان کی آواز میں سوال سے زیادہ خود کو دی جانے والی تسلی تھی۔

"بارش کی وجہ سے کوئی زیادہ مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"نہیں امی، بس تھوڑا انتظار کرنا پڑا، لیکن ابو صحیح وقت پر پہنچ گئے تھے۔"

مشعل نے ان کی فکر کم کرنے کی کوشش کی۔

ناہید بیگم نے بے فکری سے باہر کی جانب مہتاب صاحب کو متلاشی نظروں سے دیکھا۔ پھر مشعل کی طرف متوجہ ہوئیں،

"ہاں بیٹا، رزلٹ کیسا رہا؟"

"بہت اچھا، امی! میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئی ہوں!" مشعل نے فخر سے کہا۔

ناہید بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، "ماشاءاللہ، ماشاءاللہ!" انہوں نے مشعل کو گلے لگا لیا، "بہت مبارک ہو، مجھے تم سے یہی امید تھی مشعل۔ تم نے آج ثابت کر دیا کہ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔"

تبھی ان کے عقب سے مہتاب صاحب کی پرجوش آواز گونجی،

"بالکل ٹھیک کہا۔۔ مشعل نے آج ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔"

ان کی آواز میں محبت اور فخر کا امتزاج تھا۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

صبح کی دھندلی روشنی اور سرد ہوا کمرے میں خاموشی کا لبادہ اوڑھے داخل ہو رہی تھی، مگر اس خاموشی میں ایک طوفان مچل رہا تھا۔ مہتاب صاحب کا چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا تھا، ان کی آنکھیں خون کی طرح سرخ تھیں، گویا رات بھر کی بے چینی اور کرب ان میں

سمٹ آیا ہو۔ کل رات کا ناگوار واقعہ ان کے ذہن میں ایک بھیانک خواب کی طرح گردش کر رہا تھا، جس نے ان کی نیندیں چھین لی تھیں۔ کمرے میں سکوت تھا، بس مہتاب صاحب کی بے چین سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف ناہید بیگم، جن کے چہرے پر مایوسی اور بے بسی کے گہرے نقوش تھے، ایک ماں کی ممتا لیے اپنی بیٹی کے دفاع میں کھڑی تھیں۔

:

ناہید بیگم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا،

"سنے، خدا کے لیے، ہمیں زرمین کے بارے میں سوچنا ہو گا۔"

"اس کے بارے میں سوچنے کو کچھ نہیں بچا۔"

مہتاب صاحب نے نفرت سے منہ پھیرتے ہوئے کہا،

"اس نے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔"

ناہید بیگم نے اپنی آواز میں التجا بھرتے ہوئے کہا،

"وہ بے قصور ہے۔ وہ لڑکا خود آیا تھا، زرمین نے اسے نہیں بلایا تھا۔"

مہتاب صاحب نے طنز سے مسکراتے ہوئے کہا،

"بے قصور؟ وہ اس لڑکے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی پکڑی گئی، اور تم اسے بے قصور کہہ رہی ہو؟ کیا تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں رہا؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ نامحرم سے محبت کرنا کبیرہ گناہ ہے؟"

ناہید بیگم نے اپنی آنکھوں میں نمی لیے ہوئے کہا،

"مہتاب، وہ احمر سے محبت کرتی ہے۔ اور اسی محبت نے اسے تباہ کر دیا۔"

"محبت؟" مہتاب صاحب نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا،

"یہ کیسی محبت ہے جو اسے رسوائی کی طرف لے جاتی ہے؟ یہ صرف ہوس ہے۔ اور تم ہو کہ اس ہوس کو محبت کا نام دے رہی ہو؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے اصولوں میں نامحرم سے محبت کی کوئی گنجائش نہیں؟ یہ ایک کبیرہ گناہ ہے، جس کی کوئی معافی نہیں ہے۔"

ناہید بیگم نے ہمت مجتمع کر کے جیسے ہی بات شروع کرنے کی کوشش کی، مہتاب صاحب کا غصہ لاوا بن کر پھٹ پڑا۔

"اس کا رشتہ کر کے اسے فارغ کرو، بس! مجھے کوئی بحث نہیں کرنی۔"

ان کے الفاظ میں سختی اور بے رحمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی انا کے خول میں بند، اب کسی کی بات سننے کو تیار نہ تھے۔

"لیکن سلمان اس رشتے سے انکار کر چکا ہے۔۔۔"

ناہید بیگم نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو کیا ہوا؟"

مہتاب صاحب نے طنز سے مسکراتے ہوئے کہا،

"کیا اس دنیا میں مردوں کی کمی ہے؟ یا پھر تمہاری بیٹی اتنی انمول ہے کہ صرف سلمان ہی اس کا حقدار ہے؟ یا سچ یہ ہے کہ تمھاری بیٹی کسی مرد کے قابل نہیں رہی۔"

ان کی آواز میں زہر تھا، جو دل میں اتر کر اسے چھلنی کر رہا تھا۔

ناہید بیگم نم آنکھیں سے انہیں دیکھتے ہوئے رسانیت سے کہا،

"مہتاب، سلمان ہی وہ شخص ہے جو زرمین کی بے گناہی پر یقین کر سکتا ہے۔"

"بے گناہی؟ کس بے گناہی کی بات کر رہی ہو تم؟"

مہتاب صاحب نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا،

"کیا تم بھول گئی ہو کل رات کا تماشا! ہاں؟۔

کسی کو کون بتائے گا کہ تمہاری بیٹی نے کیا گل کھلائے ہیں، تم یا میں؟ برادری میں منہ دکھانے کے قابل ہوں گے؟"

مہتاب صاحب کے لہجے میں نا صرف تنفر، حقارت بلکہ تاسف بھی تھا۔

"کیا آپ اپنے اصولوں کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں؟ کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ نے ہمیشہ امانت اور دیانت کو مقدم جانا ہے؟ اگر آپ زرمین کا رشتہ کسی ایسے شخص سے طے کرتے ہیں جسے اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا جاتا، تو یہ امانت میں صریح خیانت ہو گی۔ آپ اسے بیاہ نہیں رہے، بلکہ ایک ایسی قید میں دھکیل رہے ہیں جس سے رہائی ممکن نہ ہو گی۔ وہ شخص جو چاہے اس کے ساتھ سلوک کرے، وہ ایک قیدی کی طرح بے بس ہو گی، اس کے لیے واپسی کے تمام راستے مسدود ہوں گے۔ کیا آپ یہ ظلم اپنی بیٹی پر روا رکھیں گے؟ کیا آپ اسے ایک ایسی قید میں بھیجنا چاہتے ہیں جہاں وہ ساری زندگی سسکتی رہے؟"

ناہید بیگم نے مہتاب صاحب کو ان کے اصول یاد دلاتے ہوئے بے بسی اور لاچاری سے کہا، ان کی آواز میں درد اور کرب کا عنصر نمایاں تھا۔

"وہ اسی کے قابل ہے۔"

مہتاب صاحب نے سختی سے کہا، ان کی آواز میں کوئی لچک نہ تھی۔

"اس کا گناہ اتنا بڑا نہیں کہ اسے کسی بے قدرے کے ہاتھوں ضائع کیا جائے۔ وہ سلمان جیسے باکردار اور سمجھدار لڑکے کے قابل ہے۔"

ناہید بیگم نے ممتا سے کہا، ان کی آواز میں ماں کی شفقت اور محبت کا رس گھلا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں میں امید کی ایک کرن تھی، جو مہتاب صاحب کے سخت رویے سے ٹکرا کر مدھم پڑ رہی تھی۔

"تمہیں سمجھ کیوں نہیں آتا؟ سلمان اس سے منہ موڑ چکا ہے۔ شاید اس نے بھی وہ کچھ دیکھ لیا ہے جو تم نہیں دیکھ پا رہی ہو۔"

مہتاب صاحب نے درشتی سے کہا، ان کی آواز میں حقارت اور نفرت کی تلخی تھی۔ وہ اپنی انا کے خول میں بند، اب کسی کی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ ان کے چہرے پر حقارت کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"سلمان نے زرمین کے رشتے سے انکار زرمین کے کہنے پر کیا تھا۔"

ناہید بیگم نے دبی ہوئی آواز میں کہا، ان کی آواز میں کمزوری اور بے بسی کی لہر تھی۔ وہ ایک ماں کی طرح اپنی بیٹی کے دفاع میں کھڑی تھیں، مگر ان کی آواز میں وہ دم خم نہیں تھا جو مہتاب صاحب کے غصے کو روک سکے۔

"کیا۔۔۔؟"

مہتاب صاحب گنگ ہو کر رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت، پریشانی اور تجسس کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ اس انکشاف سے بالکل لاعلم تھے۔ ان کے چہرے پر سوالات کے انبار تھے، مگر ان کی زبان خاموش تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت ہو گئے، گویا ان کے اندر کوئی طوفان برپا ہو گیا ہو۔ ان کی نظریں ناہید بیگم کے چہرے پر یوں مرکوز تھیں، جیسے وہ ان سے اس راز کی مزید تفصیل جاننا چاہتے ہوں۔ ان کی خاموشی میں ایک گہرا سوال چھپا ہوا تھا، جو ان کے دل میں ہلچل مچا رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

مہتاب صاحب نے بمشکل اپنے الفاظ ادا کیے، ان کی آواز میں غصے اور حیرت کی آمیزش تھی۔

"سلمان نے زرمین کے کہنے پر انکار کیا؟ اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔" ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

ان کے ذہن میں کئی سوالات گھوم رہے تھے، مگر ان کی انا انہیں ان سوالات کو زبان پر لانے سے روک رہی تھی۔ انہیں محسوس ہوا کہ سلمان نے بھی یہ سب برداشت کرنے کی کوشش کی ہوگی مگر اب اس کی برداشت جواب دے گئی ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ سلمان نے زرمین کی عزت کا پاس رکھا؟"

مہتاب صاحب نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"اس نے زرمین کی بات مانی، کیونکہ وہ اسے تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔"

ناہید بیگم نے جواباً دھیمی آواز میں کہا۔ تو، مہتاب صاحب کا چہرہ غصے سے شعلہ فشاں ہو گیا۔ ان کی انا بری طرح مجروح ہوئی تھی۔ انہیں یوں لگا جیسے ان کی بیٹی نے ان کے وقار کی دھجیاں اڑادی ہوں۔ ان کی آنکھوں میں اب غیظ و غضب کی چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں۔

"تمہاری بیٹی نے میری عزت کو تار تار کر دیا،"

انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا، اسے قتل کر دوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے مہتاب صاحب زرمین کے کمرے کی طرف لپکے، ان کی خونخوار نظروں میں درندگی تھی، اور وہ کمرے کی طرف اس طرح لپکے جیسے کوئی وحشی درندہ اپنے شکار پر جھپٹنے والا ہو۔ ان کے بھاری قدموں کی چاپ کمرے میں گونج رہی تھی، اور فضا میں ایک خاموش دہشت پھیل رہی تھی۔

"مہتاب، خدا کے لیے رُک جائیں!" ناہید بیگم ان کے پیچھے بھاگتی ہوئی چلائیں۔ ان کی آواز لرز رہی تھی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہوش میں آئیں!"

لیکن مہتاب صاحب غصے کے طوفان میں بہتے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے ناہید بیگم کی التجا کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ وہ آگے بڑھتے رہے، ان کے قدم زمین پر غصے سے پڑ رہے تھے۔

"مہتاب۔۔۔۔۔۔، خدا کے لیے رُک جائیں،"

ناہید بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

"اللہ کا واسطہ، ایسا کچھ مت کرنا کہ بعد میں آپ کو پچھتانا پڑے!"

انہوں نے مہتاب صاحب کا بازو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن انہوں نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

"دور ہٹو!" انہوں نے گرجتے ہوئے کہا۔

"آج میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

ناہید بیگم بے بسی سے روتی رہ گئیں، ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ انہوں نے مہتاب صاحب کو روکنے کی آخری کوشش کی، لیکن وہ بے سود تھی۔ مہتاب صاحب زرمین کے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے، ان کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں اور ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

"آنٹی، آپ نے کبھی کھل کر نہیں بتایا کہ انکل سے آپ کی شادی پسند کی تھی یا گھر والوں کی مرضی سے؟"

ایہا بہلول، راحیلہ بیگم سے یہ سوال کئی بار پوچھ چکی تھی، مگر ہر بار راحیلہ بیگم مبہم سا جواب دیتیں، ہمیشہ یہی کہتیں کہ گھر والوں کی مرضی سے ہوئی۔ لیکن آج، ایہا کی مسلسل ضد پر، انہوں نے کچھ تفصیل سے بتانے کا فیصلہ کیا۔

...

"رضا میرے اکلوتے فرسٹ کزن تھے، اور میں گھر کی سب سے چھوٹی، اماں ابا اور بھائی کی لاڈلی اور اکلوتی بہن۔

بھائی اور رضا کی آپس میں بہت اچھی انڈرسٹینڈنگ تھی، جس کی وجہ سے بھائی سے ملاقات پر ان کا گھر میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ رشتہ تو میرا بچپن سے ہی طے تھا، اس لیے شادی سے پہلے ہی ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔"

راحیلہ بیگم نے اپنی جوانی کے دنوں کی یادوں میں کھوتے ہوئے بتایا۔

...

"واہ آنٹی، یہ تو ایک طرح سے آپ کی لو میرج ہوئی نا؟" ایہا بہلول نے کہا، اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔ راحیلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے ہلکا سا سر جھکا کر خود کو مصروف ظاہر کیا۔

"اب سلمان، تم بتاؤ، زرمین سے تمہاری شادی پسند کی ہو گی؟"

راحیلہ بیگم کو مصروف دیکھ کر، ایہا سلمان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یقیناً، میری شادی میری اپنی پسند سے ہو گی، لیکن زرمین سے بالکل نہیں ہو گی۔"

سلمان نے چائے کا بھرا ہوا کپ میز پر رکھا اور اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کرسی کی پشت پر لٹکتا کوٹ اتارا، اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بیٹا، چائے تو پی لو؟"

راحیلہ بیگم نے اس کے خیالات کو بھانپتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔"

"امی، ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا۔ جب پینے کو دل کرے گا، آفس میں پی لوں گا۔"

سلمان نے کوٹ پہنتے ہوئے مضطربانہ انداز میں کہا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

:

رضا گیلانی کے بہترین دوست کی نوجوان بیٹی ایہا، جو ان کی ہمسائی بھی تھی، معصومیت کے لبادے میں چھپی ایک شاطر اور نہایت ذہین لڑکی تھی۔ کمان کی مانند بھنویں اور فیشن سے لگاؤ اسے پراسرار بناتے تھے۔ وہ اپنی باتوں سے لوگوں کو مسحور کرنے اور ذہانت سے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ماہر تھی۔

:

یقیناً، میری شادی میری اپنی پسند سے ہو گی، لیکن زرمین سے بالکل نہیں ہو گی۔"

سب جانتے تھے زرمین سلمان کی بچپن کی منگیتر اور اسکی پسند تھی۔ پھر سلمان کا یہ کہنا کہ شادی اپنی پسند سے ہو گی، زرمین سے نہیں، ایہا کو گہری سوچ میں ڈال گیا۔ کیا وقت کے ساتھ سلمان کی پسند بدل گئی تھی؟ یا کوئی مخفی راز تھا؟ یا پھر کوئی مبہم وجہ تھی جو پوشیدہ تھی؟ ایہا بے چینی سے سب جاننا چاہتی تھی،

سلمان کے ایک گنجلک فقرے نے اس کے قلب و ذہن میں کئی سوالات اور شکوک و شبہات کی ایسی پزل کھڑی کر دی جس کا کوئی جوڑ نہیں مل رہا تھا، وہ الجھ کر رہ گئی تھی، جب کہ سلمان ناگواریت قدموں تلے دبائے گھر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

:

(خیال)

:

سلمان کے باہر کی جانب بڑھتے قدموں کے ساتھ ، زرمین کے الفاظ اس کی سماعتوں پر بجلیوں کی طرح گرجنے لگے، جیسے کسی خوفناک خواب کی بازگشت ہو۔

:

"تم بہت اچھے ہو، اس میں کوئی شک نہیں، سلمان، تمہاری خوبیاں گنوائی نہیں جا سکتیں۔"

"لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"چاہے تم آسمان سے تارے توڑ لاؤ، سمندر کی گہرائیوں سے موتی چن لاؤ، یا اپنے ماتھے پر چاند سجا کر کیوں آ جاؤ، میرا فیصلہ نہیں بدلے گا۔"

شروع میں اُس کے نرم اور قدرے جذباتی لہجے میں اب مضبوطی اور پر عزم کا عنصر نمایاں ہونے لگا تھا، جبکہ آخر میں زرمین نے کرخت لہجے میں، اپنی خشمگیں نگاہیں جھکا

کر، سکڑے ہونٹوں اور جمی پیشانی کے ساتھ، تنفر و برہمی اور حقارت سے بھرے انداز میں، اپنا حتمی فیصلہ سنایا تھا۔

...

"یہ تمہارے نام کی انگوٹھی..."

"میں اسے کیسے پہن لوں سلمان؟"

"یہ میرے لیے صرف ایک انگوٹھی نہیں، ایک بندھن ہے، ایک ایسی زنجیر ہے جو اگر میرے پیروں میں پڑ گئی تو میری تخیل کی پرواز روک دے گی۔"

"تم جانتے ہو، میں نے اپنی زندگی میں بہت کم آزادی دیکھی ہے۔"

"جو تھوڑی بہت ملی تھی، یہ انگوٹھی اسے بھی چھین لے گی۔"

"یہ مجھے ہر پل یاد دلاتی رہے گی کہ میں کسی کی ملکیت ہوں، کسی کی قید میں ہوں۔"

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ یہ احساس کتنا تکلیف دہ ہے؟"

زرمین نے نرم گرم لہجے میں کہا، گویا وہ سلمان کی کسی بھی کوشش کو رائیگاں سمجھتی تھی۔ اس کے الفاظ میں ایک ایسی لڑکی کی جھلک نظر آ رہی تھی جو اپنی مرضی کی مالک تھی اور کسی بھی قیمت پر اپنی آزادی سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

...

"میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میرا دل کسی اور کے لیے دھڑکتا ہے، اور میں صرف اسی سے شادی کروں گی۔"

"اگر تم سے انکار نہ ہوا تو میں گھر چھوڑ دوں گی، مر جاؤں گی، مگر تم سے شادی نہیں کروں گی۔"

زرمین نے یہ الفاظ انتہائی غصے اور عزم کے ساتھ کہے۔ اس کے لہجے میں ایک واضح دھمکی تھی، جو سلمان کو اپنی بات منوانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کا اشارہ دے رہی تھی۔ منگنی کے جوڑے میں ملبوس اور زیورات سے لدی زرمین کا یہ روپ سلمان کے لیے کسی زہر سے کم نہ تھا۔ اس کے الفاظ، جو پہلے ہی اس کے دل پر پتھر بن کر گرے تھے، اب اس کی روح کو ریزہ ریزہ کر رہے تھے۔ سلمان کی خاموش نگاہیں اس کے دل میں اٹھتے کرب کی گواہ تھیں، جہاں اس کی امیدوں کا محل زمین بوس ہو رہا تھا۔

:

زرمین کے الفاظ، تیز ہوا کے سرکش جھونکوں کی مانند، سلمان کے ذہن میں آج بھی گونج رہے تھے۔ ہر لفظ ایک تپتا ہوا تیر تھا، جو اس کے دل کو چھید رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا، اس کی روح کرچی کرچی ہو رہی تھی۔ خراجی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے، وہ ایک ایسی تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا، جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس کے خیالات بکھرے ہوئے تھے، اور وہ اپنے ارد گرد کی دنیا سے بالکل بے خبر تھا۔

ادھر، ایہا بہلول ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی، ایک پراسرار اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہری چمک تھی، جیسے وہ سلمان کے دل میں چھپے تمام رازوں کو جان گئی ہو۔ اس کی مسکراہٹ میں فتح کا نشہ تھا، جیسے اس نے کوئی پیچیدہ کھیل جیت لیا ہو۔

سلمان کا بوجھل وجود آہستہ آہستہ ایہا کی تیز نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا، جیسے دھند میں کوئی بھٹکا ہوا سایہ گم ہو رہا ہو۔ اس کی خاموشی میں ایک گہری تلخی تھی، جو اس کے ہر قدم کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایہا کی نظریں اس کے جاتے ہوئے سائے پر مرکوز تھیں، اور اس کے چہرے پر ایک ایسا اطمینان تھا، جو کسی گہرے راز کو چھپائے ہوئے تھا۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

دروازہ یوں کھلا، جیسے کسی قدیم تہہ خانے کا زنگ آلود قفل ٹوٹا ہو۔ اور اندر کی قید میں مدفون راز، یوں ابھرا جیسے کسی قدیم پیش گوئی کا ظہور ہو۔
کمرے میں اتنی خاموشی تھی، جیسے وقت کی نبض تھم گئی ہو، اور ہر سو موت کا سرد سایہ پھیلا ہو۔ زرمین، ایک بے جان پتھر کی مورت کی مانند، فرش پر پڑی تھی، اس کی آنکھیں کسی ویران جزیرے کی طرح خالی اور بے روح تھیں۔ ٹوٹا ہوا موبائل فون، جیسے کسی سفاک ہاتھ نے اس کی امیدوں کے نازک شیشے کو پاش پاش کر دیا ہو۔ ناہید بیگم کی سانسیں جیسے کسی نے ان کے گلے میں رسی باندھ کر کھینچ لی ہوں۔ ان کا دم گھٹ رہا تھا، اور ان کی آنکھوں میں خوف اور بے بسی کا ایسا سمندر تھا، جس میں ڈوبنے والے کی کوئی امید باقی نہ رہتی۔ ان کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے کوئی اندر سے سینے کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بے بسی سے مہتاب صاحب کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں، لیکن ان کی آواز خوف اور صدمے سے کانپ رہی تھی۔
مہتاب صاحب کی نگاہوں میں غصے اور مایوسی کی ایسی زہریلی آگ تھی، جو کسی کے بھی

دل کو جلا کر راکھ کر سکتی تھی۔ ان کی رگیں تن گئی تھیں، چہرے پر غصے کی لکیریں گہری ہو رہی تھیں۔ ان کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

زرمین نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا دوپٹہ اٹھایا، جیسے اپنی عزت کے زخموں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ "ابو..." اس کی آواز اتنی دھیمی تھی، جیسے کسی نے اس کی روح کو نوچ کر اس کی چیخ کو گلا گھونٹ دیا ہو۔ مہتاب صاحب کا وہ تھپڑ، محض ایک جسمانی ضرب نہ تھا، بلکہ وہ ایک باپ کی ٹوٹتی ہوئی امیدوں کا نوحہ، اعتماد کے قتل کا ماتم، دل کے ان گنت کربوں کا لاوا، روح کے گہرے زخموں کا ابدی نشان، اور خاموش آنسوؤں کی بے زباں گونج تھا۔

"تو نے میرا سر جھکا دیا، بدبخت!"

"تو نے میری عزت خاک میں ملا دی، مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا!"

ناہید بیگم نے انہیں روکنے کی ناکام کوشش کی،

"مہتاب صاحب، خدا کے واسطے ہوش میں آیئے! اس پر رحم کیجیے، یہ آپ کی اپنی بیٹی ہے۔ اسے معاف کر دیجیے، خدا کے لیے اپنی بیٹی کو معاف کر دیں!"

وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں جا پہنچے تھے، جہاں صرف انتقام اور درد کی حکمرانی تھی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جو بے بسی کی گواہی دے رہے تھے۔ ان کے ہاتھ ہوا میں معلق تھے، جیسے کسی انجانی طاقت نے انہیں روک رکھا ہو۔

"بیٹی؟" مہتاب صاحب نے طنز سے کہا۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کا زہر تھا اور چہرے پر ایسی تلخ مسکراہٹ جیسے کسی نے ان کے دل پر نمک چھڑک دیا ہو۔

"یہ بدبخت میری بیٹی نہیں، میری پیشانی پر لگا وہ داغ ہے، وہ لعنت ہے، جس نے میری عزت کو برباد کر دیا! یہ وہ رسوائی ہے جس سے میں اب کبھی سر اٹھا کر نہیں چل سکوں

گا، جس نے مجھے زندہ در گور کر دیا... بیٹی؟ وہ میری بیٹی نہیں ہو سکتی، کبھی نہیں ہو سکتی!"

ان کی آواز میں درد اور غصے کی گونج تھی، جیسے کوئی اندر ہی اندر ٹوٹ رہا ہو۔ ناہید بیگم نے بے یقینی اور حیرانگی سے انہیں دیکھا، ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، جیسے وہ یقین نہیں کر پا رہی تھیں کہ مہتاب صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔

"ابو، پلیز رک جائیں! آپ آپی کو مار ڈالیں گے!"

مشعل نے دونوں بازو پھیلا کر مہتاب صاحب کو پیچھے سے اس طرح جکڑ لیا، جیسے کسی مضبوط زنجیر نے انہیں باندھ دیا ہو۔ اس کی چھوٹی سی جسامت میں بھی اتنی طاقت تھی کہ وہ اپنے غصے سے بپھرے ہوئے باپ کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جو اس کے دل کے خوف اور درد کی گواہی دے رہے تھے، اور اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے کوئی طوفان اندر ہی اندر برپا ہو۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں، اور اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ "ابو، پلیز!" اس نے روتے ہوئے کہا، "ابو، بس کریں! آپی کو کچھ ہو جائے گا!"

ناہید بیگم، ایک بے بس ماں کی طرح، مہتاب صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اب باقاعدہ گڑگڑا رہی تھیں۔ ان کی آواز لرز رہی تھی، اور ان کی آنکھوں میں اتنی التجا تھی کہ پتھر بھی پگھل جائے۔

"خدارا رُک جائیں! اللہ کے واسطے ہماری معصوم بچی پر اور ستم مت ڈھائیں، اسے معاف کر دیجیے!"

ناہید بیگم بار بار مہتاب صاحب کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کر رہی تھیں، لیکن ان کا غصہ ایک طوفان کی طرح بے قابو ہو چکا تھا۔

"میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا... اس نے میرے وجود کی رگ رگ کو لہو لہو کر دیا۔ میرے غرور کا مینار، میرے مان کا قصر، اور میرے وقار کا تاج... سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ میری عزت پامال ہو گئی، میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔ اس نے میری دنیا میں اندھیروں کا راج قائم کر دیا۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میری اپنی ہی اولاد میرے وقار کی چادر کو اِس بے دردی سے چاک کر دے گی۔"

زرمین فرش پر سسک رہی تھی، اس کا جسم درد سے چُور ہو رہا تھا، اور اس کی روح زخموں سے گھائل۔ مہتاب صاحب، اپنی تمام تر طاقت سے، اس کے سر پر جوتوں کی بارش کر رہے تھے۔ ہر ضرب کے ساتھ، زرمین کی چیخیں مدھم ہوتی جا رہی تھیں، اور اس کی آنکھوں میں بے بسی اور مایوسی کی گہرائی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے جسم پر پڑنے والی ہر ضرب اس کی روح کو مزید کچل رہی تھی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور چہرے پر مٹی اور آنسوؤں کی لکیریں بن گئی تھیں۔ جب مہتاب صاحب تھک کر رکے، تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، جو ان کے اندر کے طوفان کی خاموش گواہی دے رہے تھے۔

"میں نے تم پر اندھا اعتماد کیا تھا، اور تم نے میرے بھروسے کی دھجیاں اڑا دیں۔"

وہ ٹوٹے ہوئے موبائل فون کو دیکھ رہے تھے، جیسے اس میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا عکس دیکھ رہے ہوں۔ وہ لمحہ ان کے لیے قیامت سے کم نہ تھا، جب ایک باپ کی امیدوں کا محل ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو گیا تھا۔

کمرے میں صرف سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، جیسے وہاں موجود ہر شخص کی روح درد سے کراہ رہی ہو۔ ہر چہرہ غم سے نڈھال تھا، آنکھیں آنسوؤں سے سرخ تھیں۔ کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کے ساتھ ساتھ ان کے دل بھی ٹوٹ کے بکھر چکے تھے۔ اب کمرے سے باہر نکلتے ہوئے مہتاب صاحب نے بغیر مڑ کر دیکھے، دروازہ زور سے بند کیا، اور ایک ایسے فیصلے کے ساتھ راہداری میں گم ہو گئے، جس نے ان

کی زندگی کی سمت ہی بدل دی۔ بند دروازے کے پیچھے کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی، جو ان سب کے دلوں میں موجود اذیت کی عکاسی کر رہی تھی۔ یہ خاموشی اتنی گہری تھی کہ جیسے وقت تھم سا گیا ہو۔

..☆...☆...☆..

(حال):

رات اپنی خاموش چادر اوڑھ چکی تھی، اور کمرے میں ایک سکون سا چھایا ہوا تھا۔ دستر خوان سے برتن اٹھائے جا چکے تھے، اور ایک خاموش گفتگو کا سا سماں تھا۔ تبھی مہتاب صاحب نے مشعل کی طرف ایک مخملی تھیلی بڑھائی، جس کی نرم چھو سے مشعل کے دل میں تجسس کی ایک لہر دوڑی۔

"ابو جان یہ کیا ہے؟"

اس نے سوال کیا، اس کی آواز میں حیرت اور اشتیاق کے ملے جلے جذبات سے لرز رہی تھی۔

ناہید بیگم، جو برتن سمیٹ رہی تھیں، ان کی توجہ بھی اس جانب مبذول ہو گئی۔ ان کی آنکھوں میں ایک سوال تھا، جو وہ زبان پر لانے سے گریزاں تھیں۔

مہتاب صاحب نے اپنی بیٹی کے چہرے پر محبت بھری نظر ڈالی اور نرمی سے گویا ہوئے،

"یہ تمہاری ضرورت ہے، بیٹا!۔"

"میری ضرورت؟"

مشعل نے حیرت سے تھیلی کھولی۔ اندر ایک چمکتا ہوا اسمارٹ فون تھا۔

فون کو دیکھ کر ناہید بیگم کی پیشانی پر ہلکی سی فکر کی لکیریں نمودار ہوئیں، ان کی آنکھیں ماضی کی کسی گہری یاد میں کھو گئیں۔ مشعل، تاہم، مہتاب صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں کئی سوالات تھے۔

"پڑھائی کے لیے تمہیں یونیورسٹی آنے جانے میں مشکل ہو سکتی ہے، خدانہ کرے کوئی مسئلہ پیش آئے۔ معلومات اور اطلاع کے لیے یہ ضروری ہے۔ آج بارش کی وجہ سے تمہیں اپنی دوست کا فون استعمال کرنا پڑا، تب مجھے احساس ہوا کہ یہ تمہاری بھی ضرورت ہے۔ اور یہ تمہاری فرسٹ ڈویژن کا انعام بھی ہے۔"

مہتاب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مشعل جذبات سے مغلوب ہو کر مہتاب صاحب کے گلے لگ گئی۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ ناہید بیگم ہنوز خاموش تھیں، ان کی نظریں کسی دور افتادہ خیال میں الجھی ہوئی تھیں، جیسے کوئی پرانا زخم تازہ ہو گیا ہو۔

"بیٹا، ایک بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنا، یہ فون میں نے تمہیں ضرورت کے تحت دیا ہے۔ اس کا صحیح اور غلط استعمال تمہارے اپنے اختیار میں ہو گا۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ میری بیٹی مجھے مایوس نہیں کرے گی۔"

مہتاب صاحب نے اس کے معصوم چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر شفقت سے کہا۔

"ہرگز نہیں ابو، میں آپکو کبھی مایوسی نہیں کروں یہ میرا وعدہ ہے آپ سے"

مشعل نے یقین دلایا۔

ناہید بیگم کی خاموشی اب تک برقرار تھی۔ ان کی آنکھیں کسی ایسے منظر کو دیکھ رہی تھیں جو صرف انہیں نظر آ رہا تھا، جیسے کوئی پرانا زخم پھر سے رِس رہا ہو۔ ان کے دل میں خدشات اور یادوں کی ایک لہر تھی، جو انہیں ماضی کی تلخیوں میں غرق کر رہی تھی۔

اب کے ناہید بیگم نے ایک گہری سانس لی اور اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں محبت اور تشویش کا گہرا امتزاج تھا۔

"مشعل بیٹا، یہ فون تمہاری تعلیم اور معلومات کا بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن یاد رکھنا، اس کا استعمال ہمیشہ مثبت ہونا چاہیے۔"

ناہید بیگم نے متنبہ کیا، مشعل نے غور سے انہیں دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی امی، آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا صحیح استعمال کروں گی۔"

"مشعل، یہ فون صرف ایک آلہ نہیں، یہ ایک ذمہ داری ہے۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم اسے علم کا خزانہ بناؤ یا وقت کا ضیاع۔ یاد رکھو، ہر وہ کلک جو تم کرتی ہو، ہر وہ پیغام جو تم بھیجتی ہو، تمہاری شخصیت کا عکاس ہے۔ اس کا صحیح استعمال تمہیں دنیا سے جوڑ سکتا ہے، اور غلط استعمال تمہیں اپنوں سے دور کر سکتا ہے۔"

مہتاب صاحب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔

"مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ ہمیشہ ہماری امیدوں پر پورا اتری ہے۔"

ناہید بیگم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مہتاب صاحب کی طرف دیکھا۔

"میں جانتی ہوں، لیکن ایک ماں کا دل ہمیشہ اپنی اولاد کے لیے فکر مند رہتا ہے۔"

مشعل نے اپنے والدین کی طرف دیکھا اور ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"آپ دونوں کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ ہیں۔ میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی۔"

..☆...☆...☆..

(ماضی):

"شام کی مدھم روشنی لان میں پھیل رہی تھی۔ زرمین، گم سم، پرانے لکڑی کے جھولے پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں، نیلے رنگ کی مخملی جلد والی ایک ڈائری تھی، جو اس کے رازوں کی امین تھی۔ فضا میں اداسی رچی ہوئی تھی، جیسے ہوا بھی اس کے دکھ میں شریک ہو۔ دور، گلاب کے پودوں سے ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی، لیکن زرمین کا دل اس خوشبو سے بے نیاز تھا۔ آسمان پر سرخی مائل نارنجی رنگ پھیل رہا تھا، جو زرمین کے اندر جلتے ہوئے جذبات کی عکاسی کر رہا تھا۔

سامنے، گھر کی کھڑکی سے انابیہ کی پرچھائی نظر آ رہی تھی، جو زرمین پر ملامت بھری نگاہ ڈال رہی تھی۔

پرچھائی گویا کہہ رہی تھی،

"زرمین، تم نے ہمیں مایوس کر دیا۔"

پھر، پردہ گرا، اور انابیہ کی پرچھائی غائب ہو گئی۔ زرمین نے گہری سانس لی، اور ڈائری کا صفحہ کھولا۔ قلم کی نوک کاغذ پر رینگنے لگی، اور الفاظ آنسوؤں کی طرح بہنے لگے۔ جھولے کی دھیمی حرکت اور ہوا کی سرسراہٹ، زرمین کی تنہائی کو مزید گہرا کر رہی تھی۔ دور، کسی درخت پر بیٹھا بلبل، اداسی بھرا نغمہ گا رہا تھا، جیسے وہ بھی زرمین کے دکھ میں شریک ہو۔ لان کے مدھم قمقمے، زرمین کے چہرے پر پڑ رہے تھے، اور اس کی آنکھوں میں نمی صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ ڈائری کے صفحات پلٹتی جا رہی تھی، اور ہر صفحے پر اس کے دل

کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے وہ اپنی زندگی کی کہانی، ایک ایک لفظ میں قید کر رہی ہو۔

"اٹھارہ سالوں تک، میں نے خود کو ان پوشیدہ زنجیروں میں قید رکھا، جنہیں میرے والدین نے میری حفاظت کا لبادہ اوڑھایا تھا۔ میری ہنسی کی گونج مدھم پڑ گئی، میری آواز کی لہریں دب گئیں، اور میرے قدموں کو گھر کی دہلیز سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ملی۔ یہ پابندیاں، جو پہلے بوجھ محسوس ہوتی تھیں، آہستہ آہستہ ایک پرکشش جال بن گئیں، جیسے کوئی ممنوعہ پھل جس کی لذت روح کو بے چین کر دیتی ہے۔ میں نے ان زنجیروں کو توڑنے کی ناکام کوشش کی، ان اصولوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ میں نے سوچا کہ شاید باہر کی دنیا میں مجھے وہ آزادی ملے گی، جس کی میری روح پیاسی تھی۔ لیکن افسوس، باہر کی دنیا بھی اتنی ہی سنگدل نکلی۔ جس سہارے کو میں نے اپنا سمجھا، اس نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ آج، میرے دوست مجھے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، میرے گھر والے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر چکے ہیں۔ میں ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح ہوں، جو اپنی غلطیوں کی سزا بھگت رہی ہے۔ کاش میں سمجھ پاتی کہ یہ پابندیاں، یہ نصیحتیں، میری حفاظت کا مضبوط قلعہ تھیں۔ کاش میں جان پاتی کہ حقیقی خوشی ان حدود سے باہر نہیں، بلکہ ان کے اندر ہی پوشیدہ ہے۔

والدین کو اپنی اولاد پر اس طرح پابندیاں نہیں عائد کرنی چاہیے جس طرح کے اولاد سرکش ہو۔ انہیں اپنی اولاد کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھنا چاہیے تاکہ وہ ان سے اپنے دل کی بات کر سکیں۔"

..☆...✯...☆..

(حال):

جیسے ہی اس نے مہتاب صاحب کا دیا ہوا وہ انمول تحفہ اپنی سہیلیوں کو دکھایا، اس کے چہرے پر ایک عجب سی فرحت اور فخر کا امتزاج تھا۔ یہ محض ایک اسمارٹ فون نہ تھا، بلکہ اس کے والد کی محبت اور اعتماد کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔

"دیکھو تو، ابو نے میری پہلی پوزیشن پر یہ انعام دیا ہے،"

مشعل نے فخر سے کہا، اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جو اس کے دل کی گہرائیوں سے پھوٹ رہی تھی۔

آرزو نے حیرت زدہ ہو کر فون کو اپنے ہاتھوں میں لیا، اس کی انگلیوں نے اس کی چمکتی ہوئی سطح کو چھوا، گویا وہ کسی نادر شے کو چھو رہی ہو۔

"یار، یہ فون تو ٹوٹلی او پی (اوور پاورڈ) ہے! انکل نے دیا ہے؟ واہ یار! یہ تو ان ایکسپیکٹڈ لیول کا سرپرائز ہے۔ مجھے تو بالکل یقین نہیں ہو رہا کہ انکل نے تمہیں یہ گفٹ کیا ہے۔"

مشعل کی پیشانی پر بل پڑ گئے، اس نے تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا، اس کی آواز میں ہلکی سی خفگی کی جھلک تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"

"نہیں، بالکل نہیں،"

آرزو نے ہنستے ہوئے کہا،

"مگر، انکل کی بات ہی الگ ہے نا، وہ تو ویسے بھی بہت سٹرکٹ ہیں، مجھے تو بالکل بھی یقین نہیں آرہا کہ انہوں نے تمہیں یہ اتنا اوپی اور ایکسپینسو (expensive) موبائل گفٹ کیا۔ انبلیو ییبل، یار!"

مشعل نے مضبوطی سے بات کو کاٹتے ہوئے کہا،

"سخت نہیں، فکر مند ہیں۔ اور ویسے بھی، یہ تحفہ میری محنت کا صلہ ہے۔ ابو کو پتہ ہے کہ مجھے اس کی ضرورت ہے، اور وہ ہمیشہ میری خوشی چاہتے ہیں۔"

"آئمہ نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ مداخلت کی اور مشعل کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا،

"یار، یہ سب چھوڑو۔ مین بات تو بتاؤ، انکل نے فون دیتے وقت کیا لیکچر جھاڑا؟"

مشعل نے خاموشی اختیار کی، آرزو ہنستے ہوئے بولی، "یہی کہ یہ کوئی گیمنگ کنسول (Gaming Console) نہیں، بلکہ ایک ڈیجیٹل بم ہے، جس کا مس یوز اسے پلک جھپکتے ہی اڑا دے گا۔ صحیح بولا نا؟"

آرزو اور آئمہ نے ایک ساتھ زوردار قہقہہ لگایا۔

مشعل نے مصنوعی خفگی سے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا،

"ہاں، ابو نے صحیح بولا، موبائل فون کا غلط استعمال کسی کی بھی لائف سپوئل کر سکتا ہے۔"

آئمہ نے مشعل کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر اُس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا،

"یار، ریلیکس کرو۔ ہمیں پتا ہے انکل تمہاری کتنی کیئر کرتے ہیں۔ اور وہ تمہیں بہت پیار بھی کرتے ہیں۔ یہ فون جو تمہیں ملا ہے، لٹرلی (Literally) یہ تو بہت پہلے ملنا چاہیے تھا، خیر، بیٹر لیٹ دین نیور (Better late than never)، انہوں نے اپنی رسپانسبلٹی (Responsibility) پوری تو کی۔"

ناچاہتے ہوئے بھی آئمہ نے تھوڑا سا طنز کر دیا۔

مشعل نے سر ہلاتے ہوئے کہا،

"ابو اپنی ہر رسپانسبلٹی ٹائم پر پوری کرتے ہیں، لیکن ہر چیز کی ایک پرفیکٹ ٹائمنگ (Perfect timing) ہوتی ہے نا؟ اور ابو بس مجھے گائیڈ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں کوئی ایسی غلطی کروں جس سے مجھے تکلیف پہنچے۔ اور ویسے بھی، وہ مجھے اب بہت سمجھدار سمجھتے ہیں۔"

مشعل کے لہجے میں ایک پُرسکون یقین تھا، جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اپنے والد کے فیصلے کی گہرائی کو سمجھتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو والد کی محبت اور فکر کا عکس تھی۔

مشعل کی بات سن کر آرزو نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی، اور دونوں نے ایک گہری سانس لے کر مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔

"انکل کی سٹرکٹنس (Strictness) کبھی کبھی تمہیں اپ سیٹ کر دیتی ہے نا؟"

آئمہ نے مشعل کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بالکل نہیں! ان کی سٹرکٹنس (Strictness) کے پیچھے ان کا ایکسپیرینس (Experience) ہوتا ہے، جو وہ نہیں چاہتے کہ مجھے بھی ہو۔ اس لیے میں کبھی ڈسٹرب نہیں ہوتی، کیونکہ ابو کی سٹرکٹنس صرف ان کی کیئر شو کرتی ہے۔ اور مجھے پتہ

ہے وہ مجھ سے بہت محبت اور میری بہت پرواہ کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ میں ایک سکسیس فل اور ہیپی لائف جیوں۔ جو اس موبائل فون کے بغیر بھی پوسیبل (Possible) ہے۔"

آرزو نے یکدم موضوع بدلا،

"اچھا چھوڑو انکل کی باتیں، سلمان بھائی کا بتاؤ۔"

مشعل نے طنزیہ ہنستے ہوئے یونیورسٹی کے کیمپس کی طرف قدم بڑھائے،

"یہ بھی سہی، پہلے میرے ابو، اب سلمان بھائی، اور پھر میری امی کا تذکرہ بھی یاد سے کرو گی تم؟ واہ، کیا ترتیب ہے!" مشعل نے طنز سے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اب مشعل کے کہنی مارنے پر آئمہ آگے بڑھ گئی، جبکہ آرزو ان کے پیچھے بڑبڑاتی ہوئی بولی،

"بتاؤ نا، ان کا بتا دو، بس کہ انہوں نے کیا گفٹ دیا۔"

مشعل نے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا،

"ان کی بات مت کرو، انہوں نے تو روکھا سوکھا وش بھی نہیں کیا۔"

(آواز مدھم ہوتی گئی)

"یار، بتاؤ نا... کچھ تو بتاؤ..."

(آواز مزید مدھم ہوتی گئی)

"گفٹ..."

(آواز بالکل مدھم)

(منظر بدلتا ہے)

یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ پر ایک چمکدار پوسٹر لگا تھا۔

"یونیورسٹی کی سالانہ تقریب - ثقافتی شام" بڑے حروف میں لکھا تھا۔ پوسٹر کے نیچے، طلباء کی فہرست دی گئی تھی جو مختلف پرفارمنسز میں حصہ لے رہے تھے۔ مشعل کی نظریں اس فہرست پر جم گئیں۔

..☆...✯...☆..

"دفتر کی خاموش فضا میں مہتاب صاحب اور سلمان رضا گیلانی کی گفتگو کسی گہرے سمندر کی طرح پرسکون لیکن پرخطر تھی۔ اچانک، فون کی گھنٹی نے اس خاموشی کو توڑا۔ سلمان نے فون مہتاب صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے بتایا کہ ان کے والد، رضا گیلانی، بات کرنا چاہتے ہیں۔ فون پر ہونے والی طویل گفتگو نے فضا میں تناؤ پیدا کر دیا۔ گاؤں سے ایک سنگین خبر آئی تھی، ملک مقصود کا آدمی زمینی تنازعے میں قتل ہو گیا تھا، اور یہ قتل رضا گیلانی کے آدمی دل نواز کے ہاتھوں ہوا تھا۔ رضا گیلانی اور ملک مقصود کے درمیان بات چیت تو ہو گئی تھی اور ملک مقصود خاموش ہو گئے تھے، لیکن ان کا بیٹا، ملک زبیر، انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ اپنی زمین پر قبضہ کرنے کے درپے تھا۔ اس سنگین معاملے پر بات کرنے کے لیے، رضا گیلانی کی والدہ، بی بی جان، نے بھی فون پر بات کی۔

رضا گیلانی اور ملک مقصود کے درمیان زمینی تنازعہ برسوں سے چلا آ رہا تھا۔ رضا گیلانی کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ وہ ملک مقصود کی پانچ ایکڑ زمین خرید لیں، جو ان کی اپنی زمین کے درمیان واقع تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی زمین مسلسل نظر آئے، اور انہیں کسی مہمان کو یہ نہ بتانا پڑے کہ بیچ میں پانچ ایکڑ زمین چھوڑ کر آگے پھر ان کی زمین شروع

ہوتی ہے۔ لیکن ملک مقصود کسی بھی صورت میں یہ زمین فروخت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس تنازعے کی وجہ سے آئے دن جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ جب تک معاملات بڑوں کے ہاتھوں میں تھے، تب تک جھگڑے کسی نہ کسی طرح سلجھا لیے جاتے تھے۔ لیکن جیسے ہی زمینوں کی دیکھ بھال نوجوان نسل کے ہاتھوں میں آئی، یعنی ملک زبیر کے ہاتھ میں، تو مسائل خوش اسلوبی سے نپٹنا ختم ہو گئے۔ سلمان کے قابل اعتماد اور خاص بندے دل نواز اور ملک زبیر کا بندہ دونوں ہی تند مزاج اور غصے کے مالک تھے۔ اسی تندی کے باعث دل نواز کے سیدھے فائر سے ملک زبیر کا بندہ مارا گیا۔ بڑی تعداد میں دونوں اطراف کے چشم دید گواہ موجود تھے، جس کی وجہ سے رضا گیلانی کی ایڑی چوٹی کا زور لگانے پر بھی ملک زبیر خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

مہتاب صاحب اور رضا گیلانی محض کزن ہی نہ تھے، بلکہ ان کی تقدیریں بھی ایک دوسرے سے پیوستہ تھیں۔ ان کی مشترکہ زمینیں، ان کے خاندانی ورثے کی گواہ تھیں، اور آج ان زمینوں پر اٹھنے والا ہر طوفان مہتاب صاحب کی روح کو بھی مجروح کر رہا تھا۔ سلمان رضا گیلانی، جو رضا گیلانی کا اکلوتا بیٹا تھا، ان زمینوں کا محافظ بھی تھا اور شہر کی گہما گہمی میں اپنے کاروبار کا نگہبان بھی۔ لیکن آج، تقدیر نے اسے ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا، جہاں فرض اور محبت، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہم تھے۔ گاؤں کی زمینوں پر منڈلاتے خطرات، اس کی راہ تک رہے تھے۔ زمینوں کی باگ ڈور نوجوان نسل کے ہاتھ میں تھی، اور سلمان پر یہ ذمہ داری آن پڑی تھی کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی میراث کو بچائے۔ قتل نے زمینوں پر ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا تھا۔ ملک زبیر، اپنے خاص بندے کے خون کا انتقام لینے کے ساتھ ساتھ، کچھ زمینیں بھی ہتھیانا چاہتا تھا۔ یہ صرف ایک قتل کا معاملہ نہیں تھا، بلکہ زمینوں پر قبضے کی ایک سازش بھی تھی۔

مہتاب صاحب اور سلمان دونوں اس مشکل صورتحال میں پھنس گئے تھے۔ گاؤں جانا ضروری تھا، لیکن گھر پر اکیلی خواتین کو چھوڑنا بھی ناممکن تھا۔ وہ اس پیچیدہ مسئلے پر غور و خوض کر رہے تھے کہ مہتاب صاحب کے فون پر ایک اور کال آئی۔ یہ کال راحیلہ بیگم کی تھی، جو مشعل کی کامیابی کی خوشی میں انہیں کھانے پر مدعو کر رہی تھیں۔ ان کی آواز میں محبت اور اصرار تھا، لیکن مہتاب صاحب کے دل میں گاؤں کے سنگین مسئلے کی فکر تھی۔

دفتر میں بیٹھے دونوں حضرات کے چہروں پر فکر کی گہری لکیریں نمایاں تھیں۔ ایک طرف گاؤں کا سنگین مسئلہ تھا، جہاں ملک زبیر کے انتقام کا خطرہ تھا، تو دوسری طرف گھر والوں کی خوشی میں شرکت کی دعوت۔ یہ ایک ایسا موڑ تھا جہاں فرض اور محبت، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہم تھے۔"

..☆...☆...☆..

"ایک ٹوپر کو پریکٹس (practice) سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ بھی میرے ساتھ، تو بالکل نہیں۔" آئمہ نے فون پر پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"امتیاز انکل بتا رہے تھے کہ محترمہ ہدیٰ ایسوسی ایٹ (associate) والے فریش کینڈیڈیٹس (fresh candidates) ڈھونڈ رہے ہیں، ان کی کوئی بریسٹر صاحبہ ہیں جو اپنی ٹیم خود بنا رہی ہیں۔ انہیں ٹریننگ بھی خود دیں گی، سلیکشن بھی ان کا اپنا ہو گا۔" آئمہ تفصیل سے بتا رہی تھی۔

"یار، یہ خواب تم مجھے نہ ہی دکھاؤ تو اچھا ہے۔ میرا مطلب ہے، پوزیشن (position) کا پریکٹس (practice) سے کوئی تعلق نہیں ہے یار۔ پتا نہیں پریکٹس کر بھی سکوں گی کہ نہیں، اجازت لینی پڑے گی۔"

مشعل نے بے دلی سے کہا۔

"تم آج ہی انکل سے بات کرو اور انہیں قائل کرو۔ دیکھو، تم نے آج تک کیا سیکھا ہے اپنی پوری لائف میں کہ اپنے کیس کو پیش کیسے کرتے ہیں۔"

آئمہ نے جوشیلے انداز میں کہا۔

"یار، میرے ابو کو سمجھنا اور سمجھانا دونوں ہی بڑے مشکل کام ہیں۔ تمہیں پتہ ہے یار وہ میرے بارے میں کتنے پوسیسو (possessive) ہیں۔"

مشعل نے سرد مہری سے کہا۔

"سوری، کریکٹ یور سیلف۔

(sorry, correct yourself)

کنزرویٹو (conservative) ہیں۔"

آئمہ نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"ابو سے، امی سے، اِجازت لینی پڑے گی، منانا پڑے گا سب کو، محنت کرنی پڑے گی۔"

مشعل نے پژمردگی سے کہا۔

آئمہ نے مشعل کی اداس کیفیت کو بھانپ لیا۔ اس نے نرمی سے کہا،

"مشعل، تم اتنی جلدی ہمت کیسے ہار سکتی ہو؟ تم تو ایک ٹوپر ہو۔ تم نے ہمیشہ ہر مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ یہ تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ تمہیں اپنے خوابوں کے لیے جنگ لڑنی ہو گی۔ تم نے خود مختار بننے کے لیے اتنی محنت سے وکالت کی پڑھائی کی، اب پیچھے کیسے ہٹ سکتی ہو؟"

مشعل نے مایوسی سے کہا، "آئمہ، تم نہیں سمجھو گی۔ میرے ابو بہت سخت ہیں۔ وہ کبھی نہیں مانیں گے۔"

آئمہ نے سمجھاتے ہوئے کہا، "تم کوشش تو کرو۔ انہیں سمجھاؤ کہ یہ تمہارے لیے کتنا ضروری ہے۔ انہیں بتاؤ کہ تم ان کی عزت کا خیال رکھو گی۔ انہیں یقین دلاؤ کہ تم اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاؤ گی۔ انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ تم نے اپنی خود مختاری کی خاطر کتنی محنت کی ہے۔"

مشعل نے ڈرتے ہوئے کہا، "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اگر انہوں نے منع کر دیا تو؟"

آئمہ نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا، "اگر وہ منع کر دیں تو ہم کوئی اور راستہ نکال لیں گے۔ لیکن کم از کم کوشش تو کرو۔ تم نے ہمیشہ مجھے سکھایا ہے کہ کبھی ہار نہیں ماننی چاہیے۔ آج میں تمہیں وہی سبق یاد دلا رہی ہوں۔"

مشعل نے گہری سانس لی اور قدرے پر عزم لہجے میں کہا،

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے کوشش کرنی چاہیے۔"

آئمہ نے مسکرا کر کہا، "بس یہی جذبہ چاہیے۔ اب اٹھو اور اپنے ابو سے بات کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"ابھی مناسب نہیں لگ رہا، موقع ملتے ہی ان شاء اللہ ضرور کروں گی۔"

مشعل نے فوری طور پر عمل کرنے کے بجائے، اسے بعد میں کرنے کا فیصلہ کیا اور فون بند کر دیا۔

..☆...☆...☆..

کھانے کی میز پر خاموشی کا عجب سکوت طاری تھا، سوائے چمچوں کی ہلکی کھنک کے، جو اس خاموشی کو مزید گہرا کر رہی تھی۔ مہتاب صاحب، ناہید بیگم، راحیلہ بیگم سلمان اور مشعل، سب کھانے میں مصروف تھے، لیکن فضا میں تناؤ واضح تھا۔ مہتاب صاحب کے چہرے پر فکری لکیریں گہری تھیں، گاؤں کے زمینی تنازعے اور قتل کے معاملے نے ان کے ذہن کو جکڑ رکھا تھا۔ مشعل کے دل میں ایک سوال تھا، جو کسی طوفان کی طرح ابل رہا تھا۔

آخر کار، اس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور کہا،

"ابو جان، میں اپنی پریکٹس شروع کرنا چاہتی ہوں۔"

مہتاب صاحب نے چمچ پلیٹ میں رکھا، ان کی نگاہوں میں سختی تھی،

"میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے مشعل، ہمارے گھر کی بیٹیاں نوکریاں نہیں کرتیں۔ یہ ہمارے خاندانی وقار کے منافی ہے۔"

مشعل کا چہرہ بجھ گیا، امید کی کرن مدھم پڑ گئی۔ اس نے سلمان کی طرف ایسی اُمید بھری نظروں سے دیکھا گویا وہ اس کی آخری اُمید ہو، ایک ایسی نظر جس میں یہ سوال تھا کہ کیا سلمان اس کی اُمنگوں کو سمجھے گا اور اس کی حمایت کرے گا۔ اس کی نظروں میں ایک خاموش التجا تھی، ایک فریاد کہ سلمان اس کی بات سمجھے، اس کے خوابوں کی قدر کرے

اور اس کے حق میں آواز اٹھائے۔ مگر اس کی تمام امیدیں اس وقت چکنا چور ہو گئیں جب سلمان نے بھی مہتاب صاحب کی تائید کرتے ہوئے کہا،

"ماموں جان ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مشعل، تمہیں گھر پر رہنا چاہیے، گھر داری سیکھنی چاہیے۔"

سلمان کے ان الفاظ نے مشعل کے دل پر گہرا زخم لگایا، جیسے کسی نے اس کے خوابوں کو کچل دیا ہو۔ اس کی نظروں میں سوال تھا کہ کیا سلمان بھی ان روایتی خیالات کا قیدی ہے جو اس کے خوابوں کو کچل رہے ہیں؟ کیا وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہے جو عورتوں کو صرف گھر کی چار دیواری تک محدود دیکھنا چاہتے ہیں؟ کیا وہ بھی اس کی صلاحیتوں کو نظر انداز کر دے گا؟

مشعل اب اپنا کھانا ختم کر خاموشی سے اٹھی اور کچن کی طرف چل دی، اس کے قدموں میں مایوسی اور غم کا بوجھ تھا۔

راحیلہ بیگم نے مشعل کو جاتے دیکھا، اور مہتاب صاحب سے مخاطب ہوئیں،

"بھائی صاحب، مشعل کو یوں مت روکیے۔ وہ ایک قابل لڑکی ہے، اسے اپنے خوابوں کو پورا کرنے دیجیے۔"

مہتاب صاحب کی آواز میں غصہ تھا، "راحیلہ، تم عورتوں کے معاملات میں مت بولو۔ یہ مردوں کا معاملہ ہے۔ میں جانتا ہوں، مشعل کے لیے کیا بہتر ہے۔"

گاؤں کے مسئلے نے ان کی پریشانی کو اور بڑھا دیا تھا۔

"لیکن، بھائی صاحب۔۔۔" راحیلہ بیگم نے کہنا چاہا۔

"تم نے کبھی عدالت کی گندگی دیکھی ہے؟ مردوں اور عورتوں کا اختلاط؟ میں اس ماحول سے بخوبی واقف ہوں۔ ہمارے خاندان کی کوئی بیٹی وہاں کام نہیں کر سکتی بلکہ کے کوئی بھی کام نہیں کر سکتی۔"

راحیلہ بیگم نے مایوسی سے سر جھکا لیا، وہ جانتی تھیں، مہتاب صاحب اپنی بات پر بضد رہے گے۔

ناہید بیگم نے مشعل کو کچن میں جاتے دیکھا، اور اس کے پیچھے گئیں۔ انہوں نے مشعل کے کندھے پر ہاتھ رکھا،

"بیٹا، پریشان مت ہو۔ تمہارے ابو کچھ سوچ کر ہی منع کر رہے ہیں۔" ناہید بیگم نے مشعل کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز میں ہمدردی تھی، مگر بے بسی بھی جھلک رہی تھی۔

مشعل نے اپنی نم آنکھیں چھپاتے ہوئے کہا، "امی جان، مجھے پریکٹس شروع کرنی ہے۔ یہ میرے لیے بہت ضروری ہے۔"

ناہید بیگم نے مشعل کو گلے لگایا، "میں جانتی ہوں بیٹا، تم نے بہت محنت کی ہے۔ لیکن تمہارے ابو..." ان کی آواز مدھم پڑ گئی۔

راحیلہ بیگم کے بھی اٹھے کر کچن میں جانے کے بعد مہتاب صاحب نے گہری سانس لی اور پریشانی سے سلمان کی طرف دیکھا۔

"سلمان، حالات بہت نازک ہیں۔ ملک زبیر کا بندہ مارا گیا ہے اور وہ انتقام لینے پر تلا ہوا ہے۔"

سلمان نے سر جھکا کر کہا، "جی ماموں جان، میں جانتا ہوں۔ دلنواز نے غلطی کی ہے، لیکن وہ ہمارا وفادار ہے۔"

مہتاب صاحب نے کہا، "وفاداری اپنی جگہ، لیکن اب ہمیں ملک زبیر سے نمٹنا ہے۔ وہ ہماری زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔"

سلمان نے کہا، "ماموں جان، مجھے لگتا ہے مجھے گاؤں جانا چاہیے۔ میں دلنواز اور باقی گاؤں والوں سے بات کروں گا اور ملک زبیر سے بھی۔"

مہتاب صاحب نے کہا، "تمہارا جانا ضروری ہے۔ لیکن خیال رکھنا، ملک زبیر خطرناک ہے۔"

سلمان نے کہا، "میں احتیاط کروں گا، ماموں جان۔ مجھے کچھ وقت دیجئے۔ میں حالات کا جائزہ لے کر آپ کو اطلاع دوں گا۔"

مہتاب صاحب نے کہا، "ٹھیک ہے سلمان، لیکن جلد از جلد کوئی حل نکالو۔ یہ ہمارے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔"

سلمان نے کہا، "میں سمجھتا ہوں، ماموں جان۔ آپ فکر نہ کریں۔"

:

ناہید بیگم اور راحیلہ بیگم جانے کے بعد ہی، مشعل نے بکھرے برتنوں کو سمیٹنا شروع کیا۔ اس کے دل میں دکھ کی گہری ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، اور آنسو پلکوں کی اوٹ سے پھسل کر گالوں پر بہہ رہے تھے۔

تبھی سلمان کچن میں داخل ہوا اور مشعل کو اشکبار دیکھ کر، اس کا دل پسیج گیا۔ وہ قدم بڑھا کر اس کے قریب گیا اور آہستہ سے استفسار کیا، "لٹل، کیا ہوا؟"

مشعل نے کوئی جواب نہ دیا، خاموشی سے برتن سمیٹتی رہی۔ سلمان اس کے پہلو میں کھڑے ہو کر شائستگی سے کہا،

"لٹل، میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو۔"

مشعل نے آنسو پونچھتے ہوئے ایک لحظہ کے لیے سلمان کی جانب دیکھا، اور بے ساختہ اپنی ناامید نگاہیں اس کے قد آور وجود کے سامنے جھکا لیں، اُس کے چہرے پر جامد تاثرات تھے، مگر دھیمے لہجے میں گویا ہوئی، "سلمان بھائی، آپ نے بھی میری حمایت نہیں کی۔"

"مشعل، میں جانتا ہوں تمہیں برا لگا۔ لیکن ماموں جان کے حکم کی خلاف ورزی میرے اختیار میں نہیں تھی۔"

سلمان کے دھیمے لہجے میں اعتذار کرنے پر، مشعل نے سرد لہجے میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا،

"تو کیا آپ میری پریکٹس شروع کرنے کے خلاف ہیں؟"

سلمان نے گہری سانس لی، اس کے چہرے پر خاندانی روایات اور مشعل کی خواہش کے مابین کشمکش کے آثار تھے۔

مشعل نے بے تاثر چہرہ لیے سرد مہری سے استفسار کیا،

"تو کیا میں ہمیشہ ان روایات کی قیدی رہوں گی؟ کیا میری اپنی کوئی خواہش، کوئی خواب نہیں؟"

سلمان نے مشعل کے شانے پر اپنا دستِ شفقت رکھا، اُس کی آنکھوں میں گہری ہمدردی جھلک رہی تھی، مگر چہرے پر بے بسی کی داستان رقم تھی۔

مشعل نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

"آپ کبھی نہیں سمجھیں گے، کیونکہ آپ خود ان بڑوں میں شامل ہیں جو اپنی روایات کی زنجیروں میں مقید ہیں۔"

"لٹل، تم غلط سمجھ رہی ہو یار، عدالت تمہارے لیے مناسب جگہ نہیں ہے۔"

سلمان نے اپنی بے بسی چھپاتے ہوئے عاجزی سے کہا، اس کی آواز میں التجا اور ضد کی آمیزش تھی۔

"میں بالکل صحیح سمجھ رہی ہوں۔"

مشعل نے مستقل مزاجی سے جواب دیا، اس کی آنکھوں میں نمی تھی مگر آواز میں پختگی تھی۔

" صحیح سمجھ رہی ہوں نہ؟ تبھی تو میری پہلی پوزیشن کی خبر سن کر آپ کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں آئی، نہ ہی مبارکباد کا کوئی لفظ آپ کے لبوں سے نکلا۔ اور رہی بات میرے کام کی جگہ کی، تو آپ سب کو یہ بات اس وقت سمجھ میں کیوں نہیں آئی جب میں نے قانون کی راہوں پر قدم رکھا تھا۔"

اُس نے تیز لہجے میں کہا۔

سلمان خاموش رہا، اس کا چہرہ پشیمانی اور ندامت کی سرخی سے تمتما رہا تھا۔

"آپ سب ہمیشہ سے میرے خوابوں کو نظر انداز کرتے آئے ہیں۔"

مشعل نے نم آلود لہجے میں کہا، اس کے الفاظ باورچی خانے کی خاموش فضا میں گونج رہے تھے۔

سلمان نے سر جھکا لیا، جیسے اس میں نظریں ملانے کی سکت نہ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر پشیمانی کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"لٹل، سمجھنے کی کوشش کرو۔" سلمان نے دل گرفتگی سے کہا۔

"کیا سمجھنے کی کوشش کروں کہ دوسروں کی مرضی کے مطابق کیسے چلتے ہیں؟ ہاں؟ اور پلیز مجھے یہ لٹل کہنا بند کریں، اب میں وہ چھوٹی بچی نہیں ہوں جو ہر ایک کی ہر بات مانتے ہوئے ان کے کہے پر چالوں گی۔ میں اپنے خوابوں کو پورا کروں گی، چاہے پھر مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ میں کروں گی۔"

مشعل نے خشمگیں نگاہوں کے ساتھ دوٹوک الفاظ میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں حسرتوں کی نمی تیر رہی تھی۔

"آپ جیسے روایتی لوگ، جو خود کو روایات کے نام پر قید کر لیتے ہیں، دوسروں کے خوابوں کو بھی قید کر دیتے ہیں۔ آپ کبھی نہیں سمجھیں گے کہ ایک لڑکی کے لیے اپنے

خوابوں کو پورا کرنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ آپ کو تو صرف اپنی روایات کی فکر ہے، میری نہیں۔"

مشعل نے بھرائی آواز میں کہا اور پھر وہ تیزی سے کچن سے باہر نکل گئی۔ سلمان وہیں کا وہیں مبہوت کھڑا رہا، اس کی نظریں مشعل کی حرکت کرتی پیٹھ پر مرکوز تھیں، جب تک مشعل کا وجود اس کی گہری نظروں سے اوجھل نہیں ہوا، وہ اسے تکتا رہا تھا۔ سلمان کو مشعل میں آج پہلی بار زرمین کا عکس نظر آیا تھا، وہ زرمین جو کبھی خود کے لیے جبکہ آج مشعل اپنی خود مختاری کے لیے اُس سے مقابل تھی۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

مہتاب صاحب کی روح، ایک بے رحم صحرا میں بھٹک رہی تھی، جہاں پچھتاوے کی تپش اور روح کو جھلسا دینے والی تند ہوائیں چل رہی تھیں۔ آج علی الصبح ان کی زبان سے نکلے ہوئے وہ زہریلے الفاظ، زرمین کی پاکیزگی پر ایک ایسا داغ تھے، جو شاید وقت کے سمندر میں بھی نہ دھل پاتے۔

"لعنت"، "پیشانی کا داغ" اور "بدبخت" وغیرہ وغیرہ۔۔ ان کے خود کے ہی وہ کرخت کلمات، جو زہرِ قاتل کی طرح تھے، ان کے دل پر کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے اور ناقابلِ برداشت درد بن کر اُتر رہے تھے۔

دفتر کی چار دیواری میں، ان کا ذہن کسی شے پر مرکوز نہ ہو پا رہا تھا۔ وہ بار بار زرمین کے آنسوؤں اور سسکیوں کو یاد کر کے تڑپتے رہے۔ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی، ان کے قدم گھر کی جانب اٹھنے سے انکاری تھے۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کی نظروں کا سامنا کرنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔

پشیمانی کے آنسو، ان کی آنکھوں سے رواں ہو کر، ان کے چہرے کو بھگو رہے تھے، گویا ضمیر کی خلش ان کے رخساروں پر بہہ رہی تھی؛ ان کے سماعتوں میں زرمین کے لیے کہے گئے ناہنجار الفاظ، ایک کربناک نغمہ بن کر گونج رہے تھے، ہر لفظ ایک تیز دھار خنجر کی طرح ان کے دل میں پیوست ہو رہا تھا۔

وہ اپنی خطاؤں کا بوجھ لیے، ایک ایسی جگہ کی تلاش میں تھے، جہاں انہیں معافی مل سکے۔ آخر کار، انہوں نے مسجد کا رخ کیا۔ عشاء کی نماز تمام ہو چکی تھی، مسجد کی خاموشی میں ایک عجیب سی وحشت تھی۔ مہتاب صاحب کے قدم، مسجد کے دہلیز پر ہی جم گئے۔ وہ باہر کھڑے تھے، ان کی آنکھیں اشکِ ندامت سے تر تھیں، اور ان کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ ان ہاتھوں کو تک رہے تھے، جن ہاتھوں نے زرمین پر ظلم کیا تھا۔

وہ کافی دیر یونہی مسجد کے باہر ہی کھڑے، ان کے قدم اندر جانے سے قاصر تھے۔ مسجد کی خاموشی ان کے ضمیر کے شور میں ڈوب گئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی معصوم آنکھوں میں اٹھنے والے سوالوں سے شرمندہ تھے، وہ اپنی بیوی کے خاموش آنسوؤں کا سامنا کرنے سے قاصر تھے۔

اس لیے بمشکل وہ مسجد میں داخل ہوئے۔ مسجد کے صحن کے وسط میں اب وہ تنہا تھے، مسجد کے خاموش گوشے میں، ایک مدھم روشنی مہتاب صاحب کے لرزتے سائے پر پڑ رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے تھے، ان کے چہرے پر گہرے کرب کے آثار نمایاں تھے۔ ان کے ہاتھ چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے، اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی

جاری تھی۔ ان کی سسکیاں، جو دل کی گہرائیوں سے اٹھ رہی تھیں، مسجد کے پر سکون ماحول میں گونج رہی تھیں، جیسے ان کی روح کی فریاد آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہو۔ وہ اپنے رب کے حضور گڑگڑا رہے تھے، اپنے کیے پر نادم، اور معافی کے طلبگار تھے۔ ان کی ہر سسکی، ان کی روح میں اترتی ندامت کی گواہی دے رہی تھی، اور مسجد کا خاموش گنبد، ان کی توبہ کی بازگشت بن رہا تھا۔

..☆...☆...☆..

(حال):

مشعل کا غصہ ابھی تک شعلہ فشاں تھا۔ لان میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے، اس کے مرمریں پاؤں گھاس پر تیزی سے چل رہے تھے، اور اس کا چہرہ غیظ و غضب سے تمتما رہا تھا۔

"گھر داری سیکھنی چاہیے؟" اس نے زیر لب بڑبڑایا، "جیسے کہ میری زندگی کا واحد مقصد بس یہی ہے!"

اس نے اپنے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا اور مضمحل نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں تاریکی کے پردے آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ مہتاب صاحب اور سلمان اس کی خیر خواہی چاہتے ہیں، لیکن ان کے الفاظ اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہے تھے، اور اسے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔

یکایک، کسی کی نگاہوں کی حدت نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، اور سلمان کو لان کے دوسرے سرے پر سراپا فکر کھڑا پایا، اس کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

اسے دیکھتے ہی، مشعل نے اندر کی طرف قدم بڑھائے، مگر سلمان فوراً اس کے راستے میں دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔

"مانی بھائی، میرا راستہ چھوڑیے۔"

"اس نے بھیگی پلکوں سے شدید غصے کا اظہار کیا۔

"لٹل، میری بات تو سنو۔" سلمان نے نرمی سے کہا۔

"مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے گھر داری سیکھنے کے مشورے دینے والے؟"

مشعل نے غصے سے چلا کر کہا۔

اس کی بلند آواز سلمان کے کانوں میں رعدِ تند کی طرح گونجی۔

کچھ لمحے خاموشی کی نذر کرنے کے بعد، سلمان نے آہستگی سے کہا، "کوئی نہیں۔"

اس نے لاتعلقی کا ایسا مظاہرہ کیا جس سے مشعل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

دونوں کے درمیان پھر سے گہری خاموشی چھا گئی۔

"میں فقط تم سے اپنی بات واضح کرنے آیا تھا۔ تمہیں بتانے آیا تھا کہ مجھے تمہارے رزلٹ کی بہت خوشی ہے، لیکن میں کاموں میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ تمہارا رزلٹ بھی آیا ہے۔ اس لیے میری زبان سے مبارکباد کا ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ ماموں کی طرف داری کرنا، دراصل تمہاری فکر کا اظہار تھا۔ اس وقت میں اتنا پریشان تھا کہ مانتا ہوں، میری بات ذرا سخت تھی۔ لیکن وہ صرف تمہاری فکر میں تھی۔"

سلمان نے نرمی سے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔

"میں جانتی ہوں،" مشعل نے کہا، "لیکن آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں اپنی زندگی سے کچھ حاصل کرنا چاہتی ہوں، کچھ بنانا چاہتی ہوں، فقط گھر کی چار دیواری میں قید نہیں رہنا چاہتی۔"

مشعل خاموش ہوئی تو سلمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ایک مضبوط اور باصلاحیت لڑکی ہو۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو۔"

مشعل کے آنسوؤں نے اب اس کی آنکھوں کی جھیل کو بھر دیا، گرم قطرے اس کے رخساروں پر موتیوں کی طرح لٹکنے لگے جبکہ اس کی سسکیاں فضا میں رقصاں ہو کر اس کے دل کے شکستگی کی گواہی دینے لگیں۔ اس کی ہر سسکی، اس کا ہر آنسو، سلمان کے دل کو ایک انجانی بے چینی میں ڈبونے لگا۔ مشعل وہ واحد لڑکی تھی جس کی آنکھوں کی نمی تک سلمان کے دل کو چیر دیتی تھی۔ اس کے آنسو سلمان کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ مشعل کے آنسوؤں میں چھپا درد سلمان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر اس کی بے بسی کو مزید بڑھا رہا تھا۔

"لٹل! پلیز روؤ نہیں۔"

سلمان نے بے بسی سے کہا۔ اس کی آواز میں گہری تشویش اور التجا تھی۔ سلمان، جو قد آور اور سخت گیر شخصیت کا مالک تھا، جس کے رعب اور دبدبے سے سب مرعوب رہتے تھے، مشعل کے آنسوؤں کے سامنے بے بس تھا۔

"جب رونا آرہا ہے تو کیوں نہ روؤں؟"

مشعل نے اپنے آنکھوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کی آواز میں گہری اداسی تھی۔ مشعل، جو سلمان کے مقابلے میں قد میں چھوٹی تھی، سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے اور بھی معصوم لگ رہی تھی۔

"بس نہیں رونہ۔" سلمان نے نرمی سے دہرایا۔

"لیکن کیوں؟" اُس نے چڑ کر دوبارہ سوال کیا۔ اس کے آنسو ابھی تک اس کی آنکھوں میں موجود تھے۔

"کیونکہ مجھے روتی ہوئی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔" سلمان نے گہری آواز میں جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

"میں آپ کو بری لگنے اور برا لگانے کے لیے ہی تو رو رہی ہوں، ہونہہ۔"

مشعل نے اپنا چھوٹا سا قدرے سرخ ہوا ناک مسلتے ہوئے تیزی سے کہا۔ اس کے چہرے پر غصے اور اداسی کا ملا جلا تاثر تھا۔

"نہیں روؤ، جب تم روتی ہو نہ تو دل کرتا ہے ساری خوشیاں لا کر تمہیں دوں، کچھ ایسا کروں کہ تم ہنس دو۔"

سلمان نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی مقدور بھر کوشش کی اس کی آواز میں نمی اور نرمی کا عنصر نمایاں تھا۔

"مجھے ساری خوشیاں نہیں فی الحال صرف ایک خوشی چاہیے، کہ میرا خواب پورا ہو، آپ کو ابو کو یا کسی اور کو میں جاب کرنے سے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

سلمان نے اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں دیکھا اور رسانیت سے کہا۔

"اگر تمہارے خواب پورے ہونے سے تمہیں خوشی ملتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔"

مشعل نے جلدی سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مطلب آپ ابو کو منا لیں گے؟ آپ جانتے ہیں نا انہیں میری جاب سے کتنی پریشانی ہے؟"

سلمان نے مشعل کی طرف دیکھتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"میں کوشش کروں گا۔"

مشعل کی آنکھوں میں امید کی ایک کرن چمکی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر سلمان کوشش کرے گا تو یقیناً اس کے ابو مان جائیں گے۔

مشعل کی کانچ جیسی آنکھوں میں معصومیت چمک تھی، لمبی سانس لے کر وہ سلمان کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اپنی خواہش پوری ہونے پر شکر گزار ہو۔

"مجھے لگتا ہے کہ مجھے اب رونا بند کر دینا چاہیے۔" مشعل نے نم آنکھوں سے کہا۔

"ہاں، مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" سلمان نے نرمی سے جواب دیا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ جانتے تھے کہ ان کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے، ایک ایسا رشتہ جو انہیں ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب رکھے گا۔

اس خاموش لمحے میں، صرف ان کے دھڑکتے دلوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، جو ان کے درمیان موجود گہرے جذبات کی گواہی دے رہی تھی۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

ٹی وی لاؤنج میں سلمان اپنے لیپ ٹاپ پر منہمک تھا، اس کی انگلیاں کلیدی تختے پر تیزی سے رقصاں تھیں، جیسے کسی بے جان آلے کے اجزاء ہوں۔ ایہا بہلول اس کے سامنے صوفے پر چپس کترتی ہوئی بیٹھی تھی، اس کی نظریں سلمان پر مرکوز تھیں، جیسے کسی عمیق بحر میں ڈوب کر گوہر تلاش کر رہی ہوں۔

سلمان کی ہلکی جنبش پر ایہا کی سانسیں رک گئیں، اس کا دل سینے میں ایسے دھڑک رہا تھا جیسے کوئی پرندہ رات کی تاریکی میں قید کی سلاخوں سے ٹکرا رہا ہو۔ بالآخر ایہا نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے لرزتی آواز میں استفسار کیا،

"سلمان، تمہیں کس طرح کی لڑکیاں پسند ہیں؟"

سلمان اس اچانک سوال پر چونک اٹھا، اس نے اپنے عنابی لبوں پر زبان پھیری، گویا کوئی تلخ گھونٹ نگل رہا ہو۔ ایہا نے اس کی خاموشی کو اپنی بے چینی کا جواب جانتے ہوئے کہا،

"میں جانتی ہوں کہ تم میرے اس سوال پر حیران ہو۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا یوں تم سے سوال کرنا کچھ عجیب سا ہے۔ لیکن یہ سوال میرے ذہن میں بار بار کیوں ابھرتا ہے، اس کی وجہ تم بخوبی جانتے ہو۔"

سلمان نے اپنی ناگواری کو چھپاتے ہوئے سرد لہجے میں جواب دیا،

"مجھے جس طرح کی بھی لڑکیاں پسند ہوں، تمہیں اس سے کیا مطلب؟"

ایہا نے اپنی آواز میں لرزش کو ضبط کرتے ہوئے کہا، "تم بخوبی جانتے ہو کہ میرا کیا مطلب ہے۔"

سلمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے فولادی لہجے میں کہا،

"اپنی حد میں رہو، ایہا۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں، اور بار بار نہیں بتاؤں گا۔ مجھے جیسی بھی لڑکیاں پسند ہوں، تم یہ فضول سوالات مت پوچھا کرو۔"

اس کے کم آواز مگر سرد لہجے سے ابیہا کا دل چکنا چور ہو گیا، اس کی نمکین آنکھیں اندرونی کرب کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہ خاموشی و شکستگی سے اٹھی اور مضمحل قدموں سے ٹی وی لاؤنج سے باہر چلی گئی، جیسے خزاں رسیدہ برگ ہوا کے رحم و کرم پر ہو۔

سلمان کی پر سوچ نگاہیں، جو اب سکڑ کر پتھرائی ہوئی سی تھیں، ابیحہ کے بوجھل ہوتے وجود پر ٹکی رہیں، اس کی بھنویں غصے سے چڑھی ہوئی تھیں اور جبڑا سختی سے بھنچا ہوا تھا، اس کے چہرے کی رگیں تناؤ سے پھولی ہوئی تھیں اور ہونٹ ایک پتلی لکیر میں دب گئے تھے، اس کی آنکھوں میں ناگواری کی چبھن صاف نظر آ رہی تھی، اس کے چہرے پر ناگواری کے واضح آثار تھے۔ اس نے لیپ ٹاپ پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی ناکام کوشش کی، گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ تاہم، اس کے ذہن میں برپا خیالات کا تلاطم اسے بے چین کر رہا تھا۔

..☆...☆...☆..

(حال):

گاڑی چنار کھیڑا کے کچے راستے پر رینگ رہی تھی، گرد کے بادل اُڑاتی، جیسے ماضی کے دھندلے خوابوں کو چھو رہی ہو۔ سلمان کی نگاہیں دور اُفق میں کھوئی ہوئی تھیں، جہاں زرمین کے الفاظ کی بازگشت ابھی تک تازہ تھی۔

"آخر تم کیا چاہتی ہو، زرمین؟" سلمان نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

زرمین کی آواز اس کے کانوں میں گونجی،

"چار دیواری میں قید نہیں رہنا چاہتی، میں آزاد ہونا چاہتی ہوں، سلمان! اس قفسِ روایات سے پرے، جہاں میری روح پر کوئی زنجیر نہ ہو۔ میں آسمانوں کی وسعتوں میں پرواز کرنا چاہتی ہوں، ایک آزاد پرندے کی طرح، جو اپنی مرضی سے اڑتا اور اپنی منزل کا انتخاب کرتا ہے۔ میں دنیا دیکھنا چاہتی ہوں، نئی جگہیں گھومنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی زندگی کو بھرپور طریقے سے جینا چاہتی ہوں، نئے مناظر، نئی ثقافتیں، نئی کہانیاں۔ میں زندگی کو اس کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جینا چاہتی ہوں بنا کسی روک ٹوک کے، بنا کسی جبر کے۔ میں اپنی ذات کی تکمیل کرنا چاہتی ہوں، اپنی شناخت کو پانا چاہتی ہوں۔ میں آزاد ہونا چاہتی ہوں، اپنے ہر کام میں۔ میں آزاد ہونا چاہتی ہوں۔"

زرمین کی آواز میں ایک ایسی کسک تھی کہ سلمان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی۔ گاڑی رواں دواں تھی، اور اس کی نظریں سڑک کے کنارے لگے چنار کے فلک بوس درختوں، مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھروں، اور دور کھیتوں میں کام کرتے کسانوں پر پڑتی رہیں۔ ہر منظر زرمین کی آزادی کی خواہش کو مزید گہرا کر رہا تھا۔ سلمان نے گاڑی کی رفتار کم کی، جیسے وہ زرمین کی روح کی گہرائیوں میں اتر رہا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ زرمین کی یہ خواہش صرف اس کی نہیں، بلکہ ہر اس دل کی پکار ہے جو روایات کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی خواہش تھی جو ہوا میں معلق تھی، جیسے کوئی پرانا گیت، جو وقت کی دھول میں دب گیا ہو۔ سلمان کو محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسے سفر پر ہے جہاں منزل آزادی ہے، اور راستہ روح کی گہرائیوں سے گزرتا ہے۔

اب گاڑی گاؤں کے چوپال کی طرف گامزن تھی۔ سلمان کی گاڑی کو چوپال کی سمت پیش قدمی کرتے دیکھ کر، ملک مقصود کی نگاہیں تعاقب میں لگ گئیں۔ ان کے درمیان پوشیدہ رقابت کی گہری کھائی، کسی بھی ناگہانی تصادم کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔

گاؤں کی چوپال میں گرد و غبار کا ایک مبہم ہالہ پھیلا ہوا تھا، جیسے وقت کی دھول نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ دوپہر کی تپتی دھوپ میں بھی لوگوں کا ایک جم غفیر جمع تھا، جو خاموشی سے ایک وحشت ناک تماشے کا منتظر تھا۔ چارپائیوں پر بیٹھے لوگ حقے کے کش لگاتے ہوئے سرگوشیوں میں مصروف تھے، جن کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

ملک زبیر، چوپال کے عین وسط میں، ایک بلند مسند پر براجمان تھا، جیسے کسی قدیم دیوتا کا مجسمہ ہو۔ اس کے چہرے پر غصے کی سرخی ایسی نمایاں تھی جیسے کسی نے دہکتے انگاروں سے اسے داغ دیا ہو۔ اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے، جو اس کی تند مزاجی اور غضبناکی کی عکاسی کر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں، جو عام حالات میں بھی تیز اور نیلگوں تھیں، آج غصے کی شدت سے خونخوار ہو رہی تھیں۔ ان میں ایک وحشیانہ چمک تھی، جو اس کے تند و تیز مزاج کی عکاسی کر رہی تھی، جیسے کسی درندے کی آنکھیں اپنے شکار پر مرکوز ہوں۔ اس کی ناک، جو قدرے خمیدہ تھی، اس کے مغرور اور متکبر ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔ اس کے ہونٹ، جو عام طور پر سخت اور بے حس تھے، آج غصے کی شدت سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کے بال، جو عام طور پر بے ترتیبی سے بکھرے رہتے تھے، آج بھی اسی حالت میں تھے، جیسے کسی نے انہیں جان بوجھ کر بکھیر دیا ہو۔ یہ انتشار اس کے لاپرواہ اور بے نیاز ہونے کی نشانی تھی۔ اس کے ہاتھ، جو بڑے اور مضبوط تھے، آج بندوق اور چاقو کو اس طرح تھامے ہوئے تھے جیسے وہ ان کے ساتھ پیدا ہوا ہو۔ اس کی انگلیاں، جو موٹی اور گٹھلیوں والی تھیں، اس کی سخت محنت اور طاقت کا اظہار کر رہی تھیں۔ اس کی کلائی پر ایک موٹی سونے کی زنجیر بندھی ہوئی تھی، جو اس کی دولت اور اثر و رسوخ کی علامت تھی۔ اس کے پاؤں میں چمڑے کی بھاری جوتی تھی، جس پر مٹی اور دھول کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ یہ جوتی اس کے دیہاتی اور کھردرے مزاج کو ظاہر کر

رہی تھی۔ اس کا لباس، جو میلے رنگ کی شلوار قمیض پر مشتمل تھا، اس کے دیہاتی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے غیر رسمی اور غافل رویے کا بھی ثبوت دے رہا تھا۔ اس کے کپڑوں کے بٹن کھلے ہوئے تھے، اور سینے پر بالوں کا ایک گھنا جنگل نظر آ رہا تھا۔ یہ عدم توجہی اس کے لاپرواہ اور بے نیاز رویے کی عکاسی کر رہی تھی۔

اس کے سامنے ایک نوجوان، ڈر سے کانپتا ہوا، بندھے ہاتھوں کے ساتھ کھڑا تھا، جیسے کسی قربانی کا بکرا ہو۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، اور اس کی آنکھوں میں موت کا خوف صاف نظر آ رہا تھا۔ دو بڑے اور خونخوار کتے، زنجیروں سے بندھے ہوئے، جو اس نوجوان پر جھپٹنے کے لیے بے تاب تھے، جیسے کسی شکاری کے اشارے کے منتظر ہوں۔

ملک زبیر کی آواز میں گرج تھی، جیسے آسمان سے بجلی کڑک رہی ہو،

"تم نے میری بات نہیں مانی، اب اپنی جان کی خیر مانگو۔"

ملک زبیر کے سرد اشارے پر، خونخوار کتوں کو چھوڑ دیا گیا، اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح نوجوان پر جھپٹ پڑے۔ چوپال کی خاموش فضا، جہاں حقے کے دھوئیں کی کڑواہٹ اور نوجوان کے پسینے کی نمکین مہک رچی تھی، اس کی دلخراش چیخوں سے لرز اٹھی۔ جیسے کسی نے روح کے تاروں کو بے رحمی سے چھیڑ دیا ہو۔ لیکن ملک زبیر، چوپال کے وسط میں بیٹھا، حقے کے گہرے کش لیتا رہا۔ اس کی آنکھیں جلتے ہوئے کوئلوں کی مانند چمک رہی تھیں، جیسے وہ نوجوان کی تکلیف کا ذائقہ چکھ رہا ہو۔ ہر چیخ، جو چوپال کی خاموشی کو چیرتی، ملک زبیر کی مسکراہٹ کو ایک شکاری درندے کی طرح مزید گہرا کرتی، جیسے وہ اس نوجوان کی تکلیف سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

نوجوان کی چیخیں کتوں کے بھونکنے میں دب رہی تھیں، جس سے چوپال میں موجود ہر شخص کی روح خوف سے لرز گئی، لیکن ملک زبیر کے لیے، یہ محض ایک کھیل تھا، ایک ایسی کہانی جس میں وہ خود ظالم کردار تھا۔

اس کی ہنسی، جو چوپال کے ہنگامے میں زہر کی طرح گھل رہی تھی، ایک وحشیانہ قہقہے کی طرح تھی، جیسے کوئی بھیڑیا کڑکتی دوپہر میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

نوجوان کی چیخیں چوپال کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھیں، جیسے اس کی روح قید ہو گئی ہو۔ ملک زبیر کے ذہن میں، یہ نوجوان ایک کھولنے سے زیادہ کچھ نہیں تھا، ایک ایسا کھلونا جسے وہ اپنی مرضی سے کھیل رہا تھا۔ اس کی بے رحمی، جو اس کے رگ و پے میں رچی بسی تھی، اسے نوجوان کی تکلیف سے ایک شیطانی لذت فراہم کر رہی تھی۔

چوپال کی مدھم روشنی میں، تماشائیوں کے سائے دیواروں پر رینگ رہے تھے، جیسے وہ بھی اس ظلم کا حصہ ہوں۔ ہوا میں معلق حقے کا دھواں، ایک تاریک پردے کی طرح، چوپال کے منظر کو مزید پراسرار بنا رہا تھا۔ نوجوان کی دردناک چیخیں، جو اس کی بے بسی کی انتہا کو بیان کر رہی تھیں، چوپال کی فضا میں گونج رہی تھیں۔ اس کی اذیت ناک تکلیف، جو اس کے جسم کو مروڑ رہی تھی، ملک زبیر کے لیے ایک شیطانی تفریح کا ذریعہ تھی۔

چوپال میں بیٹھے لوگ خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف اور احترام کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ملک زبیر کی مرضی کے خلاف جانا کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ فی الحال گاؤں میں اس کی حکمرانی تھی، اور اس کی بات کو ٹالنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ وہ انصاف نہیں کرتا تھا، وہ صرف اپنی مرضی چلاتا تھا۔ اور آج، اس نے ایک اور مثال قائم کر دی تھی، جیسے کسی ظالم بادشاہ نے اپنی رعایا پر ظلم کا پہاڑ توڑا تھا۔

چوپال کی فضا میں خوف اور خاموشی کا ایک گہرا سایہ پھیل گیا تھا، جیسے کسی نے وقت کو منجمد کر دیا ہو۔ ہر طرف موت کی خاموش دھمکی، اور زندگی کی بے بسی تھی۔

نوجوان کی چیخیں فضا کی خاموشی کو چیرتی ہوئی دوبارہ گونجیں، اور پھر، جیسے کسی سیاہ عفریت نے زمین کو جکڑ لیا ہو، ایک گہرے رنگ کی گاڑی کے پہیے زوردار بریکوں کی چنگھاڑ سے جام ہوئے۔ ٹائروں کی چرچراہٹ نے ہوا میں زہر گھول دیا، اور گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھا، جس نے چوپال کے منظر کو دھندلا دیا۔ سلمان کی فولادی گاڑی، کسی تاریک پیش گوئی کی طرح، چوپال کے عین سامنے آکر رک گئی۔

گاڑی کا دروازہ ایک سرد آہنی دھماکے سے کھلا، اور سلمان، جس کا چہرہ کسی سنگلاخ چٹان کی طرح بے تاثر تھا، باہر نکلا۔ اس کے سیاہ چمکتے بوٹوں نے زمین پر قدم رکھتے ہی ایک خاموش دھمک پیدا کی، جیسے کسی خاموش طوفان کی آمد کا اعلان کیا۔ اس کا سیاہ لباس، گرم ہوا کے سیال باز جھونکوں کے ساتھ تیزی سے لہرا رہا تھا، جبکہ آنکھوں میں عزم کی وہ سرد چمک تھی، جو کسی برف پوش پہاڑ کی چوٹی کی طرح جان لیوا تھی۔

سیاہ چشمے کی اوٹ میں چھپی سلمان رضا گیلانی کی نظریں چوپال پر گڑی تھیں، جہاں ملک زبیر بیٹھا تھا۔ اب اس نے اپنے لباس کے بٹنوں کو ایک فیصلہ کن انداز میں درست کیا، اور شیر کی طرح وقار کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے، ملک زبیر کی طرف بڑھنے لگا۔

سلمان کے چہرے کے نقوش، جو ہمیشہ پرسکون اور پُراعتماد رہتے تھے، آج کسی گہرے سمندر کی سطح کی طرح خاموش اور پُراسرار تھے۔ اس کی ہر حرکت میں ایک ٹھہراؤ تھا، ایک ایسا ٹھہراؤ جو کسی آنے والے طوفان کی پیش گوئی کر رہا تھا۔

ملک زبیر کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ ناچ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں وہ وحشی درندگی تھی، جو ایک شکاری کو اپنے شکار کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ اس کا انداز، کسی ایسے شخص کا تھا، جو کسی خونی جنگ کا منتظر ہو۔ سلمان کو دیکھتے ہی، ملک زبیر نے اپنے آدمیوں

کو ایک سرد اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی، آدمیوں نے کتوں کی رسیوں کو وحشیانہ انداز میں کھینچنا شروع کر دیا۔ ان کی کوشش تھی کہ نوجوان کو ان خونخوار جانوروں سے دور رکھا جائے۔ ان کی آنکھوں میں وہ بے رحمی تھی، جو اس چوپال کے ماحول کو مزید خوفناک بنا رہی تھی۔

چوپال میں موجود لوگوں کے چہروں پر، اب خوف اور تجسس کے ملے جلے تاثرات تھے، جیسے وہ کسی وحشی کھیل کے تماشائی ہوں۔ فضا میں نوجوان کی دبی دبی سسکیاں اور ایک عجیب سی خاموشی تھی، جو کسی آنے والے طوفان کی پیش گوئی کر رہی تھی۔ یہ خاموشی، کسی گہرے سمندر کی سطح کی طرح ساکن تھی، مگر اس کے نیچے ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

صبح کی زرد شعاعوں نے جب زرمین کے کمرے میں جھانکا، تو وہ ایک ایسی تصویر بنی پڑی تھی جس میں رات بھر کی اذیتوں نے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ اس کی روح زخموں سے چور، اور دل میں ایک ایسا خلا تھا جو کسی گہرے سمندر کی تہہ میں پوشیدہ رازوں کی طرح خاموش تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی، اس کا جسم درد سے کراہ رہا تھا، اور اس کے چہرے پر کل رات کے تشدد کی داستان رقم تھی۔

آنکھوں کے نیچے نیلے دائرے، سر پر زخموں کے نشانات، اور بکھرے ہوئے بال اس کی بے بسی کی گواہی دے رہے تھے۔

ایک رات میں اس کی زندگی کی قیمت سراسر گر گئی تھی، عزت اور اعتماد کی تمام دیواریں مسمار ہو چکی تھیں۔

برآمدے میں اپنے والدین کی آواز سنتے ہی، اس کے دل میں زہر آلود تیر پیوست ہو گئے۔ مہتاب صاحب اور ناہید بیگم گفتگو میں مصروف تھے۔ مہتاب صاحب کا لہجہ پہلے سے زیادہ نرم تھا، ان کی آواز میں شکست اور ندامت کی گہری لہر تھی، جیسے کسی مضبوط قلعے کی دیواریں ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں۔

"میں سلمان سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔"

انہوں نے ناہید بیگم سے کہا، ان کی آواز میں وہ درد تھا جو کسی پہاڑ کے ٹوٹنے سے پیدا ہوتا، ایک ایسا درد جو ان کی انا کے ریزہ ریزہ ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔

"اگر مجھے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو جوڑ کر معافی مانگنی پڑی، یا اس کے قدموں میں گر کر بھی اسے راضی کرنا پڑا، تو میں اپنی عزت کے خاطر سب کچھ کروں گا۔"

زرمین نے جب مہتاب صاحب کے یہ الفاظ سنے، تو اسے کل رات ان کا اسے گالم گلوچ اور ذلیل کرنا یاد آیا۔ اُس نے سرد آہ بھری۔ اسنے یہ تلخ احساس ہوا کہ اس کے والد اپنی عزت بچانے کے لیے سب کچھ کرنے پر آمادہ ہیں، مگر اس کی اپنی عزت کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں کر رہے۔ زرمین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ یہ آنسو کسی امید کے نہیں، بلکہ اس درد کے تھے جو اس کے والد کی بے بسی پر اُبل رہے تھے۔ اس کے دماغ میں مہتاب صاحب کے کلمات نے ایک منفی سوچ کو جنم دیا، وہ یہ سمجھنے لگی کہ اس کے ابو فقط اپنی عزت کی خاطر سلمان کے پاس جا رہے ہیں، حالانکہ وہ اس کی عزت بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

مہتاب صاحب کے خارجی دروازے کی طرف بڑھتے ہی، وہ اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئی۔ اس کی نگاہ دراز پر پڑی، اور وہ ایک انجانے جذبے کے زیرِ اثر اس کی طرف بڑھی۔

دراز کھولتے ہی، اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی، اور اس نے کسی چیز کو مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ چیز کیا تھی، یہ راز اب تک دراز کے اندر ہی مخفی تھا، لیکن اس کی گرفت میں، زرمین کے دل میں ایک عزم کی چنگاری روشن ہو رہی تھی۔

زرمین نے اپنے ہاتھ میں اس شے کو مضبوطی سے تھامے کُلی سے چادر اُتاری اور اپنے مخصوص انداز میں اوڑھی، اب اُس نے دہلیز کی جانب یوں قدم بڑھائے، جیسے کوئی بھٹکا ہوا مسافر کسی انجان منزل کی تلاش میں نکل پڑا ہو۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اور قدم لڑکھڑا رہے تھے، اُس کے ذہن میں کوئی واضح منصوبہ نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ اسے اس گھر سے دور جانا ہے، جہاں اس کی روح کو کچلا گیا تھا۔ وہ ایک ایسی دنیا کی تلاش میں تھی، جہاں اسے انصاف ملے، جہاں اس کی عزت بحال ہو۔ وہ ایک ایسی منزل کی طرف رواں تھی، جس کا راستہ تاریک اور انجان تھا، لیکن اس کے دل میں ایک خاموش عزم تھا، ایک ایسا عزم جو اسے ہر رکاوٹ کو پار کرنے کی ہمت دے رہا تھا۔

زرمین نے جب گھر سے قدم باہر رکھا تو جیسے اس نے ماضی کے تمام دروازے بند کر دیے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

ناہید بیگم کی آواز، ایک ماں کی فریاد، ہوا میں تحلیل ہو رہی تھی،

"زری بیٹا، کہاں جا رہی ہو؟ خدا کے لیے رُک جاؤ!"

لیکن زرمین کا دل پتھر کی طرح سخت ہو چکا تھا۔

اس کے لڑکھڑاتے قدم ایک ایسے راستے پر گامزن تھے جس کی منزل واضح نہیں تھی۔ صبح کی پہلی کرنوں کے ساتھ وہ ایک مبہم سا نقش بن کر افق میں کہیں غائب ہو گئی، اس کی نگاہوں میں ایک طرف انتقام کی تپتی ہوئی لو رقصاں تھی، تو دوسری جانب، ایک مدھم سی کرن امید کی بھی جھلملا رہی تھی۔

وہ گھر کی دہلیز پار کر کے کس راہ کی مسافر بنی تھی؟ کیا اس کے قدم اس بے رحم کی جانب بڑھ رہے تھے جس نے اس کی روح کو کرچی کرچی کر دیا تھا، یا اس مسیحا کی طرف جو ان کرچیوں کو سمیٹ کر مرہم لگا سکتا تھا؟

کیا اس کی منزل وہ دہکتا ہوا الاؤ تھا جہاں انتقام کی بھڑکتی ہوئی لو اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی، یا وہ خلوت کدہ جہاں شاید معافی کی خنک ہوا اور ندامت کی شبنم اس کی کچلی ہوئی روح کو قرار بخشتی؟

..☆...☆...☆..

AESTHETIC NOVELS
EXPLORE, DREAM AND READ
IG:AESTHETICNOVELS.ONLINE

قسط نمبر 4

سلمان نے اپنی بات ایک مخصوص فاتحانہ انداز میں جاری رکھی، جس کی ہر لہر میں ایک ایسا رچا ہوا یقین تھا جو سننے والوں کو سحر زدہ کر دیتا، مگر اس یقین کی تہہ میں ایک ایسی گہری تحقیر پنہاں تھی جو ملک زبیر کی برسوں کی اکڑ فوں اور اس کے زعمِ انا کو ریت کے ذروں کی مانند بکھیر دینے کی طاقت رکھتی تھی۔

زبیر "! سلمان نے گویا کسی حقیر کیڑے کو مخاطب کیا، اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے ملک زبیر کے غضبناک وجود پر "ٹھہریں، جیسے کسی بے وقعت شے کا سرسری جائزہ لے رہا ہو۔

"تم خون کا بدلہ چاہتے ہو، اور میں تمہیں وہ پیشکش کر رہا ہوں جو تمہاری حیثیت کے مطابق ہے۔ تمہارا ایک ادنیٰ بندہ مارا گیا، اور میں اس کے بدلے اپنے ایک وفادار کی جان پیش کر رہا ہوں۔ یعنی کہ جان کے بدلے جان۔ تمہارا وہ بندہ، تمہارا وفادار تھا، ہے نا؟"

اسی اثنا میں، ایک کتا دھیرے دھیرے سلمان کی طرف بڑھنے لگا۔ سلمان کے عنابی لبوں پر ایک سرد اور زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میرا شیرو بھی میرا بہت وفادار ہے۔ وفاداری کا سودا وفاداری سے ہی چکایا جاتا ہے۔ میں تمہیں اپنے اس وفادار کتے کی جان اس خون کے عوض پیش کرتا ہوں جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو۔ کیا خیال ہے؟"

سلمان نے بظاہر اپنی توجہ شیرو پر مرکوز کر رکھی تھی، مگر درحقیقت وہ ملک زبیر کے ردعمل کو جانچ رہا تھا۔ ملک زبیر کی نظریں بھی اس خموش طبع کتے پر گڑی تھیں جو اس کے قدموں میں بیٹھا تھا، اور سلمان ایک فاتحانہ انداز میں اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ جبکہ ملک زبیر کے چہرے پر غصے اور حیرت کا ایک عجیب امتزاج تھا۔ اس کی بھنویں آپس میں جڑی ہوئی تھیں اور اس کی آنکھیں غصے سے دہکتے سرخ انگاروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور اس کے نتھنے غصے سے پھول رہے تھے۔

چوپال پر ایک گہری خاموشی چھائی تھی، جسے صرف زمین پر بے سدھ پڑے نوجوان کی دبی دبی اور بے ترتیب ہانپنے کی آوازیں توڑ رہی تھیں۔

"ملک زبیر! اپنی اس نام نہاد غیرت کے پردے کو ذرا ہٹا کر دیکھو! تمہیں پتہ چلے گا کہ جس چیز کا تم ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو، وہ دراصل تمہاری پست اور گھٹیا فطرت کا عکاس ہے۔ تمہارا وہ بندہ، جس کی وفاداری کے تم اپنی لگائی گئی پنچایت میں سب سے بلند بیٹھ کر قصیدے گا رہے ہو، اپنے 'شکار' کو زیر کرنے میں بری طرح ناکام رہتا، اور کسی طرح سے دلنواز کے ہاتھوں مرنے سے بچ نکلتا، تو کیا تم اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرتے؟ کیا تمہاری آنکھوں میں اس کے لیے ذرا برابر رحم یا کوئی بھیک بھی ہوتی؟ قطعاً نہیں! تم خود اسے مجمع عام میں گھسیٹ کر ذلیل و خوار کرتے ہوئے لاتے اور اس کی ناکامی کی سزا میں اُسکی بوٹیاں نوچ لیتے۔"

سلمان نے اب اس نوجوان کی طرف حقارت سے اشارہ کیا جو گرد آلود زمین پر بے حس پڑا کراہ رہا تھا اور جس کے پھٹے پرانے کپڑے اس پر ٹوٹنے والے وحشی کتوں کی دردناک کہانی بیان کر رہے تھے۔

"یقیناً تم اسے ایسی عبرت ناک سزا دیتے کہ دنیا یاد رکھتی! بندوق کے سیدھے نشانے پر کھڑا کر کے تم اس سے پوچھتے کہ اس نے دلنواز کو زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ تم کس قدر بزدل اور ناکارہ ثابت ہوئے! تمہاری ناکامی ناقابل معافی ہے اور اس کی سزا صرف موت ہے"!

غصے سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا، سلمان کی اگلی بات گویا اس کے لیے ایک دھماکہ تھی۔

"جس طرح تم آج اس نوجوان کے لیے انصاف کا ترازو اٹھائے بیٹھے ہو، تمہاری اس بے وقعت وفاداری کی اس سے زیادہ قیمت تو نہیں لگتی۔"

سلمان نے اب طنزیہ انداز میں کتے کے پیٹ پر دوبارہ ہاتھ پھیرا اور پھر بے نیازی سے ملک زبیر کی طرف کروٹ بدل لی، گویا وہ اس کی موجودگی کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا۔

جبکہ سلمان کے ان زہر آلود الفاظ میں چھپا ہوا طنز سیدھا ملک زبیر کے دل پر نشتر کی طرح پیوست ہوا تھا۔ چوپال میں بیٹھے ہوئے بہت سے لوگوں نے اس تضحیک آمیز وار کو محسوس کیا، اور ان کے چہروں پر ناگواری کے ساتھ ایک واضح حیرانی نمایاں تھی۔ ایک انسان کے خون کے بدلے ایک کتے کی حقیر جان کی پیشکش، نہ صرف غیر متوقع تھی بلکہ اس میں ملک زبیر کی کھلی تذلیل کی جا رہی تھی۔

ملک زبیر، سلمان کی اس ذلت آمیز پیشکش اور اس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں اٹھنے والے ممکنہ رد عمل سے اندر ہی اندر جل رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ انگارے کی مانند دہک رہا تھا اور اس کی آواز میں ایک ایسی سختی اور کرختگی آ گئی جیسے کوئی پتھر بول رہا ہو۔

"تم میری توہین کر رہے ہو! کیا تمہاری گھٹیا نظر میں ایک بے زبان کتے کی زندگی میرے بندے کے بہائے گئے خون کے برابر ہے؟"

اسی لمحے، ملک مقصود نے اپنے بیٹے کو ایک سرد اور گہری نظر سے دیکھا جس میں واضح تنبیہ اور گہری سمجھداری دونوں شامل تھیں۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ سلمان کی بے پناہ دولت، ناقابلِ تسخیر طاقت اور معاشرے میں بلند مقام ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ مزید برآں، دلنواز نے جو کچھ بھی کیا، وہ بظاہر اپنی حفاظت میں تھا، اور اس واقعے کو بنیاد بنا کر زمین کا مطالبہ کرنا کسی بھی طرح سے قانونی طور پر درست نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو مزید اشتعال انگیزی سے روکتے ہوئے کہا،

"زبیر، بس کرو۔ اب اس معاملے کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔"

ملک زبیر غصے کی شدت سے پھٹ رہا تھا، لیکن اپنے باپ کی بات کو رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ وہ سلمان کو نفرت سے گھورتا رہا، لیکن پتھر کی طرح خاموش ہو گیا۔ چوپال پر تناؤ ابھی بھی اپنی جگہ قائم تھا، لیکن اب اس میں ایک نئی اور پیچیدہ کیفیت شامل ہو گئی تھی۔ سلمان کی ہوشیاری اور ملک زبیر کی بے بسی کا تلخ احساس۔ سب کی نظریں اب اس بات پر مرکوز تھیں کہ ملک زبیر اس ذلت آمیز صورتحال پر کیا ردعمل ظاہر کرے گا۔

..☆...☆...☆..

"ابو جان، یہ میرے مستقبل کا سوال ہے، اور میری پوری زندگی اسی پر منحصر ہے۔"

مشعل کی آواز میں ایک ایسی کسک رچی ہوئی تھی جو مہتاب صاحب کے برسوں کے جمود کو توڑتی، ان کے یقین کی مضبوط بنیادوں کو بھی لرزا رہی تھی۔ اس کی التجا میں ایک ایسا درد تھا جو دل کی گہرائیوں سے اٹھ رہا تھا۔

اس نے دھیمے لیکن پر عزم لہجے میں کہا،

"ابو، آپ نے خود ہی تو ہمیں سکھایا ہے کہ یہ دنیا ایک جنگل کی مانند ہے۔ لیکن آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ہمیں جانوروں کی طرح زندگی بسر نہیں کرنی چاہیے۔ "

اس نے ایک لمحے کے لیے سانس روکی، جیسے اپنے اگلے الفاظ کی سنگینی کا وزن محسوس کر رہی ہو۔

"جنگل میں جانور کیسے جیتے ہیں؟ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ بس دو ہی خوف ان کی زندگی کا محور ہوتے ہیں— کوئی انہیں مار نہ ڈالے، اور وہ خود زندہ رہنے کے لیے کسی کو مارنے پر مجبور نہ ہوں۔"

اس کی نمناک آنکھوں میں ایک عزم کی لو روشن تھی، جو کسی بھی قیمت پر بجھنے والی نہیں تھی۔

"ابو، ہم انسان بھی تو اسی دائرے میں گردش کر رہے ہیں۔ ہر لمحہ اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کوئی ہمیں نقصان نہ پہنچا دے، یا کوئی بے رحم حادثہ ہماری سانسوں کی ڈور کاٹ کر ہمیں بے موت نہ مار دے۔"

اس نے توقف کیا اور ایک گہرا سانس لیا،

"جانور محض اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہیں، اپنی انفرادی زندگی کے لیے جیتے اور مرتے ہیں۔ لیکن میں "...

اس کی آواز میں ایک ایسی خواہش موجزن تھی جو محض زندہ رہنے سے کہیں زیادہ بلند تھی۔

"میں اس جنگل میں قانون کی راہوں پر چلنا چاہتی ہوں۔ میں مظلوموں کو انصاف دلاتے ہوئے اس برائی کو 'مارنا' چاہتی ہوں جو انہیں کچل رہی ہے۔"

اس نے اپنے نازک ہاتھوں کو مضبوطی سے بھینچ لیا، گویا اپنے عزم کو مجسم کر رہی ہو۔

" ابو! میں خود مختار بننا چاہتی ہوں اور اپنے فیصلوں میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں وکالت کے شعبے اپنا ایک نمایاں مقام بناؤں۔"

اس کی آواز میں التجا کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط عزم بھی جھلک رہا تھا۔

"ابو، اس سے پہلے کہ یہ خواہش مرجھا جائے اور میں اڑنا بھول جاؤں، مجھے اس قید سے آزاد کرنے کا کیا فائدہ؟ آپ میرا سہارا بنیے، میرا ہاتھ تھامیے، تاکہ میں اپنی پرواز جاری رکھ سکوں اور اس دنیا کے بے رحم اور گھنے جنگل میں انصاف کی ایک ایسی مشعل روشن کر سکوں جس کی روشنی میں سب کے لیے ایک نئی راہ بنے، ایک ایسا عادلانہ راستہ جس پر تمام لوگ اپنے حقوق کے ساتھ باہم چل سکیں۔"

مشعل کی درد بھری التجا مہتاب صاحب کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ ان کی برسوں کی وہ خواہش جو اپنی بیٹی کو دنیا کی تلخیوں سے محفوظ رکھنے کے گرد گھومتی تھی، آج اس کے جواں عزم کے سامنے بے بس دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی یہ بیٹی کسی عام لڑکی کی طرح نہیں ہے۔ اس کے اندر ایک ایسی بے چین روح ہے جو تمام زنجیروں کو توڑ کر اپنی منزل کا تعین خود کرنا چاہتی ہے۔ اب یہ ان پر منحصر تھا کہ وہ اس کی اس پرواز میں حائل ہوتے ہیں یا اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے بازوؤں کو سہارا دے کر اسے آسمان کی لامحدود وسعتوں کی جانب اڑنے دیتے ہیں۔ کمرے میں ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا، جس میں صرف مشعل کی دھڑکتی ہوئی امید اور مہتاب صاحب کے گہرے، پیچیدہ خیالات کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

اسی اثنا میں مہتاب صاحب کے ذہن میں سلمان رضا گیلانی کا وہ بصیرت افروز خیال گونجا، جس نے انہیں مشعل کو اس کی مرضی کی راہ منتخب کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ کیا:

"ماموں جان! کہتے ہیں نا کہ پرندے کو اگر زور سے پکڑا جائے تو مر جاتا ہے اور اگر آہستہ پکڑا جائے تو اڑ جاتا ہے۔ لیکن اگر اعتدال کے ساتھ محبت کی پکڑ سے پکڑا جائے تو وہ خود آپ کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے والدین کو بس اس نازک نکتے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مشعل کو بھی اگر پیار اور اعتماد کی فضا میں اس کی امنگوں کے مطابق زندگی گزارنے دی جائے تو وہ یقیناً اپنی منزل کو پالے گی۔ اسے روکنے کی کوشش کی گئی تو وہ ایک ایسی باغی بن جائے گی جس کی تمام تر توانائیاں اپنی زنجیریں توڑنے میں صرف ہو جائیں گی، اور شاید وہ کبھی بھی وہ سب کچھ نہ کر پائے جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔"

مہتاب صاحب پر چھائی خاموشی گہری ہوتی چلی گئی۔ مشعل کی ایک ایک بات ان کے دل میں اترتی چلی گئی، ان کے برسوں کے خیالات کو زیر و زبر کرتی ہوئی۔ وہ اس کی باتوں کی گہرائی اور اس کے دل میں چھپے عزم کو محسوس کر رہے تھے۔ یہ محض ایک خواہش نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی پکار تھی جو اس کی روح سے اٹھ رہی تھی۔

مشعل کی استدلال میں ایک منطق کارفرما تھی، ایک ایسا سچ تھا جس سے وہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جس جنگل کی بات کر رہی تھی، وہ اس سے بخوبی واقف تھے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی بیٹی اس جنگل میں محض ایک تماشائی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اس کے اندر ایک ایسی قوت تھی جو اسے ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے پر اکساتی تھی۔

بالآخر، مہتاب صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی نظریں مشعل کی پر عزم آنکھوں سے ملائیں۔ ان کی آواز میں ایک نرمی تھی، ایک ایسا پیار تھا جو برسوں کی شفقت کا مظہر تھا۔

"مشعل، "انہوں نے اپنی گہری نظریں اس پر مرکوز کیں اور انتہائی دھیمے لہجے میں گویا ہوئے،

"تمہاری باتوں نے میرے دل پر یہ نقش کر دیا ہے کہ تم اپنی خود مختاری کے عزم میں کس قدر پختہ ہو۔ تمہارے اندر انصاف کی ایک ایسی تڑپ ہے جو تمہیں اس ناانصافی کے سامنے کبھی سر نہیں جھکانے دے گی۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اس دنیا کی تلخیوں سے اپنی آغوش میں چھپائے رکھنے کی
کوشش کی، لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اپنے راستے کا انتخاب خود کرنے کا حق حاصل ہے۔"

مشعل کی آنکھوں میں ایک چمک سی نمودار ہوئی، ایک ایسی امید جو ابھی دم توڑنے ہی والی تھی۔

مہتاب صاحب نے اپنی بات جاری رکھی، ان کے لہجے میں ایک خاص اپنائیت رچی ہوئی تھی۔

"اور اسی لیے، مشعل، وکالت کی یہ راہ جو تم نے منتخب کی ہے، میں اس میں تمہارے شانہ بشانہ ہوں۔ کیونکہ یہ دنیا، بے سہارا لوگوں کے لیے، ایک ایسے ظالم جنگل کی مانند ہے جہاں کوئی قانون نہیں، صرف طاقتور کا حکم چلتا ہے۔ جس طرح جنگل میں مضبوط جانور کمزوروں کو اپنا نوالہ بناتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی بااثر لوگ غریبوں اور بے کسوں کا استحصال کرتے ہیں۔ تمہاری وکالت ان مظلوموں کی ڈھال بنے گی اور اس بے رحم جنگل میں انصاف کی آواز بلند کرے گی۔"

مشعل کی حیرت دیدنی تھی۔ اس نے شاید اتنی آسانی سے رضامندی کی توقع نہیں کی تھی۔

مہتاب صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وضاحت کی،

"تم جانتی ہو، سلمان اکثر مجھ سے تمہاری باتوں کا ذکر کرتا تھا۔ وہ تمہارے خیالات کی گہرائی اور تمہارے مضبوط ارادے سے بہت متاثر تھا۔ دراصل، ایک مرتبہ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر پرندے کو محبت اور اعتماد کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق اڑنے دیا جائے تو وہ اور بھی اونچی پرواز کرتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ تمہاری خواہش کو دبانا تمہیں توڑ دے گا۔"

انہوں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور پھر مشعل کی سمت دیکھ کر گویا ہوئے،

"سلمان کی باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا۔ اور آج، تمہاری اپنی باتوں نے میرے یقین کو اور پختہ کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی مرضی سے زندگی جیو اور وہ سب کچھ کرو جو تمہارا دل چاہتا ہے۔ میری دعا ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔"

مشعل کی آنکھوں سے خوشی اور اعتماد کے آنسو چھلک پڑے۔ سلمان کے ذکر نے اس اجازت کو ایک خاص اہمیت دی اور اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ اپنے خوابوں کو حقیقت بنا سکتی ہے، اس کے پروں میں آسمان چھونے کی طاقت آ گئی۔ یہ محض ایک اجازت نہیں تھی، بلکہ اس طویل اور کٹھن جدوجہد کا پہلا ثمر تھا جس میں ایک خاص شخص کی محبت اور یقین انجانے میں ہی سہی، ہر قدم پر اس کا سہارا بنے رہے۔ اس لمحے، اسے مہتاب صاحب کی خاموش رضامندی میں ایک گہرا یقین محسوس ہوا، ایک ایسا سہارا جس کے بل پر وہ اپنی منزل کی جانب پہلا قدم اٹھانے کے لیے تیار تھی۔ اب جب مشعل نے اپنی منزل کی جانب پہلا قدم اٹھانے کا عزم کیا تھا، تو اس کے دل میں اس شخص کی وہ روشن خیالی گونج رہی تھی جس کا نام اس کے دل کے کسی گوشے میں دھیرے دھیرے

اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ کیا یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اس کی آزادی کی پہلی کرن اس شخص کے خیالات سے روشن ہوئی تھی؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو اس کے مستقبل کے راستے کو دھندلا سا روشن کر رہا تھا۔

..☆...☆...☆..

(ماضی):

یونیورسٹی کا احاطہ الوداعی محفل کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ برقی قمقموں کی مدھم روشنی اور دلوں کو اداس کر دینے والی موسیقی کی لہریں فضا میں رقص کناں تھیں، جہاں فارغ التحصیل طلباء مستقبل کی کشادہ راہوں پر پرواز کرنے سے پہلے اپنی بے فکری کے ان لمحات کو بھرپور انداز میں جینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس شور و غل کے درمیان، زرمین ایک تنہا جزیرے کی مانند کھڑی تھی، اس کے بکھرے ہوئے بال، جنہیں اس نے لاپروائی سے اپنی چادر میں چھپا رکھا تھا، اور اس کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی گزشتہ شب کی کسی تلخ کہانی کی چغلی کھا رہے تھے۔

ہنسی کے ایک بے ساختہ قہقہے کی گونج میں، احمر کی نظر اچانک اس پر پڑی۔ وہ چند قدم کے فاصلے پر ساکت کھڑی اسے گہری نظروں سے تک رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی احمر کے چہرے سے مسکراہٹ ایسے محو ہو گئی جیسے کبھی نمودار ہی نہ ہوئی ہو۔ زرمین آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھی، اس کا ہر قدم ایک بے زباں سوال لیے ہوئے تھا۔ لیکن احمر اپنی جگہ پر اس وقت تک مجسم کھڑا رہا، جب تک زرمین بالکل اس کے سامنے نہیں آ گئی۔ اور پھر، جب وہ عین اس کے روبرو آ گئی، تو دونوں کی آنکھیں ایک ایسی

خاموش زبان میں گفتگو کرنے لگیں جس میں جدائی کا جان لیوا درد اور نہ ملنے کا ابدی افسوس رچا ہوا تھا، ایک ایسا سرسری رابطہ جو انہیں اس دنیا کی قید سے پل بھر کے لیے ماضی کی حسین یادوں کے دھندلکے میں لے گیا، مگر لوٹتے ہوئے دلوں پر اداسی کی ایک گہری اور دائمی چھاپ ثبت کر گیا۔

پھر اچانک احمر کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنے کھوئے ہوئے خیالات کی دنیا سے پلٹ آیا۔ زرمین ٹھیک اس کے سامنے کھڑی تھی اور اس کی دھیمی مگر صاف آواز نے احمر کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند کو چھانٹ دیا۔ "مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

احمر اس کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ ایک ناقابل یقین کیفیت میں اس نے زرمین کا بازو تھاما اور اسے کھینچ کر ہجوم سے پرے، یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا کی طرف لے گیا۔

اب وہ دونوں کیفے ٹیریا کے ایک پرسکون گوشے میں میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ احمر دو گلاس جوس لے کر آیا اور میز پر رکھے۔ زرمین نے اس کی جانب دیکھے بغیر دھیمی آواز میں کہا،

"مجھے ایک گلاس سادہ پانی لا دو۔"

احمر نے خاموشی سے تعمیل کی اور پانی لے آیا۔ زرمین نے آہستہ سے ایک گھونٹ بھرا، گویا اپنے اندر کی مضطرب لہروں کو سکون بخش رہی ہو۔

زرمین کے میز پر پانی کا گلاس آدھا کر کے رکھتے ہی احمر نے التجا بھرے اور لرزتے ہوئے لہجے میں معافی مانگنی شروع کر دی،

"زرمین، خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ کل رات جو کچھ بھی ہوا، میں بہت ڈر گیا تھا۔ پلیز مجھے معاف کر دو..."

اس کی آواز التجا اور ایک گہرے خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ بار بار یہی بے ربط الفاظ دہراتا رہا، اس کی آواز میں ایک واضح شرمندگی اور بے بسی نمایاں تھی۔

زرمین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سرد اور بے تاثر لہجے میں کہا، "نہیں، پہلے میری بات سنو۔"

اس کی آواز میں کوئی شکوہ یا شکایت نہیں تھی، بس ایک گہرا اور ناقابلِ بیان دکھ پنہاں تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا،

"تم تو کہتے تھے میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔"

جب زرمین پانی پی کر فارغ ہوئی، تو احمر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ وہ دوبارہ منت سماجت کرنے لگا، اس کی آواز عاجزی اور انکساری کی انتہا کو چھو رہی تھی۔

زرمین نے گہری اور پر معنی نظروں سے اسے دیکھا اور آہستہ سے بولی،

"تم کہتے تھے نا محبت اندھیرا نہیں، بلکہ ایک ایسی روشنی ہے جو گھنے اندھیروں کو بھی چیر دیتی ہے۔ ایک ایسا نازک پھول ہے جو دل کی بنجر زمین میں بھی اپنی جڑیں پکڑ لیتا ہے اور اپنی خوشبو سے پورے ماحول کو مہکا دیتا ہے، اور ہمیں ایک نئی اور روشن دنیا کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن تمہاری محبت نے تو مجھے اندھیروں کی ایک ایسی گہری کھائی میں دھکیل دیا ہے جہاں اب میری آواز سننے والا بھی کوئی نہیں ہے۔"

احمر بے قرار ہو گیا، اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

"نہیں زری، ایسا مت کہو۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے، میں مانتا ہوں۔ لیکن میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں اب میری محبت پر یقین نہیں آئے گا، لیکن میرا یقین کرو، میں اب بھی تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ تمہارے لیے اب بھی اپنی جان دے سکتا ہوں۔"

زرمین کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی اور بولی، "اچھا، جب کوئی مرد کہے نا کہ وہ تمہارے لیے مر سکتا ہے، تو اسے مرنے کا ایک ایسا موقع دینا چاہیے کہ وہ دوبارہ زندہ ہونے کا خواب بھی نہ دیکھ سکے۔"

زرمین نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنی سختی سے بھینچی ہوئی مٹھی کھولی۔ تو میز پر اس کی اور احمر کے درمیان چھوٹی، سفید گولیاں بکھر گئیں—وہ نیند کی گولیاں تھیں، جن میں موت کا خاموش اور حتمی پیغام پوشیدہ تھا۔ زرمین کی آنکھوں کی بے رحمانہ چمک نے اسے کھانے کا اشارہ کیا تو ایک لمحے کے لیے احمر کے حواس جیسے مفلوج ہو گئے۔ وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے سامنے پڑا جوس کا گلاس اپنی جگہ پر، وقت کے تھم جانے کا گواہ تھا۔

(مرنے کا ایک ایسا موقع دینا چاہیے۔)

زرمین کے ان سفاک الفاظ نے اس کے دل پر کسی برفیلے تیر کی طرح گہرا گھاؤ لگایا تھا۔ اُس نے بے یقینی سے اپنی کپکپاتی ہوئی ہتھیلیوں کو دیکھا، گویا ان پر لکھی اپنی المناک تقدیر کو پڑھنے کی لاچار کوشش کر رہا ہو۔ اس کے کشادہ ماتھے پر پسینے کی ننھی بوندیں اور نمایاں ہو گئیں،۔ جنہیں اس نے ایک مضطرب اور بے یقینی کی کیفیت میں صاف کیا۔ اس کی آواز میں التجا اور ایک گہرا کرب رچا ہوا تھا جب اس نے بمشکل پوچھا،

"زرمین، یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کیا تمہیں واقعی یہ لگتا ہے کہ میں اتنا خود غرض اور بے حس ہو سکتا ہوں؟ کیا تمہیں میری محبت پر ذرّہ برابر بھی یقین نہیں رہا؟"

زرمین کی آنکھوں میں ایک گہری اداسی تھی، جس میں تلخی کی ایک باریک لکیر بھی جھلک رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی طنز آمیز مسکراہٹ اسی تلخی کا اظہار تھی، گویا وہ کہہ رہی ہو کہ اگر وہ سچ میں اس سے محبت کرتا تو اسے مرنے کے لیے کہنے پر سوال نہ کرتا، بلکہ فوراً اس کے ایک اشارے پر وہ گولیاں کھا لیتا۔ اس نے دھیرے سے سر ہلایا اور ایک گہری سانس لے کر کہا،

"احمر، تمہیں محبت کی دل فریب باتیں بہت بنانی آتی تھیں۔ تمہارے پاس لفظوں کا ایک ایسا وسیع سمندر تھا، جس میں تم مجھے گہرے غوطے دیتے تھے۔ تم کہتے تھے کہ محبت ایک ایسا ابدی سفر ہے جو ہمیں ہمیشہ نئی اور حسین منزلوں کی طرف لے کر جاتا ہے۔"

"ہاں، کہتا تھا۔"

احمر نے میز پر رکھے ہوئے گلاس کو اتنی سختی سے پکڑ لیا کہ اس کے پور سرخ پڑ گئے۔ اس کا لہجہ قدرے تیز اور دفاعی تھا۔

"اور میں اب بھی وہی کہتا ہوں۔"

زرمین نے ایک سرد آہ بھری۔

"لیکن اب ہماری منزلیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہیں۔ ہمارے راستے اب ایک دوسرے سے بہت دور نکل گئے ہیں، اور تم مجھے اندھیروں کی گہری وادی میں تنہا چھوڑ گئے ہو۔ تم نے مجھے ایک ایسی تاریکی میں دھکیل دیا ہے جہاں روشنی کی کوئی کرن باقی نہیں رہی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

احمر کی آواز میں گھبراہٹ اور بے چینی کی لہر واضح طور پر بڑھتی گئی۔

"ہم ابھی بھی ایک ہی راستے کے مسافر ہیں، محبت کے راستے کے۔ کچھ معمولی غلط فہمیاں ہیں، جنہیں ہم مل کر با آسانی دور کر سکتے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں التجا تھی، وہ چاہتا تھا کہ زرمین اس کی بات سمجھے، اس کے دل کی گہرائی کو محسوس کرے۔ وہ بے چینی سے بار بار میز پر رکھا جوس کا گلاس اٹھاتا اور اس میں موجود جوس کی مقدار کم کرتا جاتا، گویا ہر گھونٹ کے ساتھ وہ اپنی بے بسی کو نگل رہا ہو۔۔۔

زرمین اب خاموشی سے اس کی بے ربط باتیں سن رہی تھی، اس کی سرد اور بے تاثر نظریں کبھی احمر کے مضطرب چہرے پر ایک جامد نقطے کی طرح ٹِک جاتیں، تو کبھی میز پر رکھے گلاس پر یوں مرتکز ہو جاتیں جیسے اس کے اندر کوئی پوشیدہ راز رقم ہو۔ اس کے مبہم تاثرات احمر کے لیے ایک ایسی پیچیدہ پہیلی تھے جس کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ رہی تھی، بس ایک ساکت اور بے جان وجود کی طرح بیٹھی اسے گھور رہی تھی، گویا اس کی روح کسی اور دور افتادہ اور پر اسرار جہان میں محوِ پرواز ہو۔ احمر بے چینی سے بار بار جوس کا گلاس اپنے خشک لبوں سے لگاتا اور خالی کرتا رہا، ہر گھونٹ اس کے دل میں ایک انجانا خوف اور بڑھتا ہوا تجسس انڈیل رہا تھا۔ زرمین کی یہ پر اسرار خاموشی ایک گہرے سکوت کی مانند تھی، جس کے پیچھے کسی بھی لمحے ایک دھماکہ ہو سکتا تھا۔ جب احمر نے گلاس میں موجود جوس کا آخری گھونٹ بھی پی لیا، تو اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے زرمین کے چہرے پر گئیں۔ اس پر ایک ایسی تھکن نمایاں تھی جو جسمانی سے کہیں زیادہ روح کی گہرائیوں سے اُبھری تھی۔ اس نے خالی گلاس میز پر ایک بے جان سی حرکت کے ساتھ رکھا، گویا اس کے اندر کی ساری توانائی نچڑ گئی ہو۔ وہ کچھ دیر اسی طرح ساکت بیٹھا رہا، اپنی نگاہیں زرمین پر مرکوز کیے ہوئے، اس آخری امید کے ساتھ کہ شاید اب سکوت ٹوٹے گا، کوئی ردعمل سامنے آئے گا۔ اسی لمحے، زرمین نے میز پر رکھی ہوئی مہلک گولیوں کو اپنی لرزتی ہوئی مٹھی میں اور سختی سے بھینچ لیا، اس کا چہرہ ایک ناگہانی عزم سے تمتمانے لگا، اور اس کی سرد آنکھوں میں ایک ایسی تیز اور قاتل چمک نمودار ہوئی جو پہلے کبھی کسی نے نہ دیکھی تھی۔ اس نے گہری اور فیصلہ کن نظروں سے احمر کو دیکھا، اور ایک ایسا جان لیوا جملہ ادا کیا جو اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک چیخ کی صورت میں نکلا تھا،

زرمین کا یہ مختصر مگر زہر آلود جملہ،

"تمہاری محبت نے مجھے بغاوت کا حق بھی نہ دیا، ورنہ میں اس ظالم اور بے رحم دنیا سے بھی لڑ کر تمہیں چھین لیتی اور صرف اپنی بنا لیتی،"

اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے اس کربناک دھوکے اور اس سے پیدا ہونے والی انتقامی آگ کی ایک چیخ تھی۔ یہ محض الفاظ نہیں تھے، بلکہ اس کی روح کی وہ کسک تھی جس نے اسے ایک ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا جو اس کی نرم خو فطرت سے سراسر بعید تھا۔

اس کا باوقار انداز میں اپنی جگہ سے اٹھنا، اس کی سیدھی اور تنی ہوئی کمر جو اس کے فولادی ارادے کی خاموش گواہی دے رہی تھی، اور اس کا اپنی چادر کو سلیقے سے درست کرنا، یہ سب اس بات کا واضح اعلان تھا کہ اب وہ کسی بھی قسم کی کمزوری کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دے گی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی سرد چمک تھی جو یہ بتا رہی تھی کہ اب حساب چکتا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اس کا ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا اس بات کی واضح اور حتمی علامت تھی کہ اس نے اپنی گزری ہوئی محبت کے تمام پل توڑ دیے ہیں، اور اب اس کے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں باقی نہیں بچا ہے۔ اس کے کیفے ٹیریا سے باہر نکلتے ہی احمر کی کربناک چیخ، جو خاموشی کو چیرتی ہوئی بلند ہوئی، اس بات کا ثبوت تھی کہ زہر اپنا کام دکھا رہا ہے، اور احمر کو اپنے دھوکے کی قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔

احمر ساکت بیٹھا اس دھندلے ہوتے منظر کو دیکھتا رہا، اس کا دماغ اس اچانک ہونے والے انکشاف سے مکمل طور پر سن ہو چکا تھا۔ اس کے سر میں ایک ہلکی سی کپکپی محسوس ہو رہی تھی، گویا کسی نے اس کے دماغ پر زور سے ہتھوڑا مار دیا ہو۔ اس کی آنکھیں اس پر یقین نہ کرنے والے انداز میں اس خالی جگہ پر جمی تھیں جہاں کچھ لمحے پہلے زرمین کھڑی تھی۔ اس کا دل ایک گہرے اور خاموش کنویں کی طرح خالی تھا، جس میں اب صرف پچھتاوے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ پھر اچانک اس کے معدے میں ایک شدید

درد کی لہر اٹھی، ایک ایسی ناقابلِ برداشت تکلیف جو اس کی روح کی گہرائیوں تک اتر گئی وہ کراہ اٹھا، یہ جانتے ہوئے کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ زہر، جو زرمین نے اسے اس کی چھوٹی محبت کے بدلے میں دیا تھا، اپنا کام مہلک شروع کر چکا تھا۔

زرمین کے ذہن میں ایک تیز خیال بجلی کی طرح کوندا، اسے وہ لمحہ یاد آیا جب احمر پانی لینے اپنی جگہ سے اٹھا تھا، اس کی پریشان اور بے چین نظریں اور وہ مبہم بے قراری جسے وہ اس وقت سمجھ نہیں پائی تھی۔ اب تمام ٹکڑے آپس میں جڑ گئے تھے، اور اسے ایک خوفناک اور ناقابلِ یقین حقیقت کا تلخ ادراک ہوا—اس نے جلدی میں زہر آلودہ گولیاں احمر کے جوس میں ملا دی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے اس بات سے ڈرتی تھی کہ محبت اسے گھنے اندھیروں میں دھکیل دے گی، اور آج اس کی اندھی محبت نے اسے ایک ایسی تاریک وادی میں لا کھڑا کیا تھا جہاں صحیح اور غلط کی تمیز مکمل طور پر مٹ گئی تھی۔ اس نے وہ کر دیا تھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا—اس نے احمر کو اس دھوکے کی سزا دی تھی جو اس نے محبت کے نام پر اسے دیا تھا۔ اگر وہ اس کے لیے محبت میں نہیں مرا، تو اس نے خود اسے اس کی جھوٹی محبت کا ابدی صلہ دے دیا تھا۔ اب پچھتاوے اور خوف کے ایک نہ ختم ہونے والے بوجھ تلے دبے ہوئے اس کے لرزتے ہوئے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

..☆...☆...☆..

(حال):

سلمان اپنے کمرے میں وضو کے بعد آستینیں نیچے کر رہا تھا۔ اس کی انگلیوں سے ابھی بھی پانی کے ٹھنڈے قطرے ٹپک رہے تھے، جب بیڈ پر رکھے اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین پر "لٹل برڈ" کا نام جگمگا رہا تھا۔ ایک بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی، مگر اس سے پہلے کہ وہ کال اٹھا پاتا، رابطہ منقطع ہو گیا۔ سلمان کے دل میں ایک ہلکی سی چبھن ہوئی، جیسے کوئی خوبصورت لمحہ ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ دوسری جانب، مشعل ابھی جائے نماز سے اٹھی ہی تھی، اس کے وجود میں ایک عجیب سا روحانی سکون پھیلا ہوا تھا۔ اس نے آہستگی سے اپنے حجاب کی گرفت ڈھیلی کی، اور اس کی نظریں بے اختیار موبائل کی اسکرین کی طرف اٹھیں، جہاں "گائیڈن اینجل" کا ایک میسیج موجود تھا:

"نماز پڑھ لوں پھر بات کرتا ہوں۔"

یہ میسیج دس بج کر تیرہ منٹ پر موصول ہوا تھا۔ مشعل نے اپنا فون دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا، اور اس کی ہتھیلی پر بے چینی سے انگلی پھیرتے ہوئے سلمان کے میسیج یا کال کا انتظار کر رہی تھی۔ تبھی، ٹھیک دس بج کر تیس منٹ پر، سلمان کی کال آئی اور اس نے پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا، جیسے وہ اسی لمحے کی منتظر تھی۔

"آپ نے نماز پڑھ لی؟"

مشعل نے سلام لیے بغیر، بے تابی کے عالم میں پہلا سوال کیا۔ اس کی آواز میں ایک جلدی تھی، جیسے وہ جانتی تھی کہ یہ سوال سلمان کے لیے کتنا اہم ہو گا۔ سلمان کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے نرمی سے جواب دیا، "جی، الحمدللہ۔"

"اتنی جلدی؟" مشعل کا دوسرا سوال فوراً آیا، اس کی آواز میں حیرت اور تجسس تھا۔ فون کی دوسری جانب، سلمان نے اثبات میں سر ہلایا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مشعل اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا، "ہاں، بالکل۔"

"دعا مانگی؟" مشعل نے پوچھا، اور دونوں جانب ایک لمحے کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ فضا میں ایک ان کہی کیفیت معلق تھی، جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ پھر مشعل نے ایک گہری سانس لی، اس کی آواز میں ایک خاص سوز، ٹھہراؤ اور پختہ یقین تھا۔

"مانی بھائی، کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم اس سے باتیں کریں، اپنی خوشیاں بانٹیں اور اپنی تکلیفیں بیان کریں۔ دعا بھی تو کچھ ایسی ہی ہے۔ یہ ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان ایک سیدھا اور خالص رابطہ ہے۔ نماز تو ایک فرض ہے، ایک حکم ہے جس کی تعمیل ہم کرتے ہیں، لیکن دعا اس تعمیل کو روح بخشتی ہے۔ یہ ہماری عاجزی کا اظہار ہے، یہ یقین دہانی ہے کہ کوئی ہے جو ہماری سنتا ہے، ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اگر ہم نماز پڑھ کر دعا نہیں مانگتے، تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم نے اپنے محبوب کو خط تو لکھا ہو، مگر اس میں اپنا حالِ دل بیان ہی نہ کیا ہو۔ کیا ایسا نہیں لگتا کہ جیسے کچھ ادھورا رہ گیا ہو؟ اور سنا ہے، جو بندہ اپنے رب سے مانگنا چھوڑ دیتا ہے، اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے، کیونکہ مانگنا بندگی کی نشانی ہے۔"

سلمان، مشعل کی ہر بات کو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا۔ مشعل کی آواز میں گندھا خلوص اور پختہ یقین اس کی روح کی گہرائیوں میں سرایت کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک گہرا تاثر ابھرا، جیسے کئی پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ گئے ہوں۔ چند لمحے وہ خاموش رہا، گویا مشعل کی باتوں کی تہہ تک اتر رہا ہو۔ پھر، ایک گمبھیر لہجے میں گویا ہوا:

"مشعل، تم نے تو میری سوچ کا رخ ہی موڑ دیا۔ مجھے کبھی اس زاویے سے خیال آیا ہی نہیں تھا۔"

مشعل نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اچھا جی، تو پھر میری کوئی بات سمجھ بھی آئی یا ساری آپ کے سر کے اوپر سے ہی گزر گئیں؟"

اس نے قدرے توقف کے بعد چھیڑتے ہوئے پوچھا۔ سلمان نے فی الفور جواب دیا، اس کی آواز میں قلب کی گہرائیوں سے اٹھنے والی سچائی اور فہمیدگی کی جھلک نمایاں تھی۔

"تمہاری کوئی بھی بات میرے سر کے اوپر سے نہیں گزرتی، لٹل۔ سیدھا میرے دل میں اترتی ہے اور کہیں گہرائی تک جا کر ٹھہر جاتی ہے۔"

سلمان کی بات سن کر مشعل کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ ابھری، جو پل بھر میں گہری سوچ میں بدل گئی۔ اس کے سینے میں جیسے ان کہے احساسات کی ایک لہر سی دوڑ گئی، دل کی دھڑکنیں معمول سے کچھ تیز ہو گئیں۔ فون کے دونوں اطراف چند لمحوں کا سکوت چھا گیا، ایک ایسا سکوت جس میں بہت سے ان کہے لفظ پنہاں تھے۔ سلمان نے محسوس کیا کہ مشعل کے سانس لینے کا انداز بدل گیا ہے، وہ سمجھ گیا کہ اس کے الفاظ نے مشعل کے ذہن میں کچھ ہلچل مچائی ہے۔ اس نے نرمی سے پوچھا،

"کیا ہوا لٹل؟ یک دم خاموش کیوں ہو گئیں؟ سب ٹھیک ہے نا؟"

مشعل نے ایک گہری سانس لی، اپنی اندرونی کیفیت کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کی آواز میں ہلکی سی ہچکچاہٹ تھی، جیسے الفاظ زبان پر آنے سے پہلے ترتیب پا رہے ہوں۔

"وہ... وہ میں نے آپ کو پہلے کال کی تھی نا،" اس نے بالآخر خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

سلمان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، اس کی آواز میں اپنائیت اور خوشی گھلی تھی۔

"شکریہ؟ کس بات کا بھلا؟"

"ابو جان کو ماننے کے لیے،" مشعل نے جلدی سے کہا، اس کی آواز میں بے ساختہ شکر گزاری اور ولولہ تھا۔

"آپ نے ان سے بات کی اور وہ مان گئے کہ میں کام کر سکوں۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے، مانی بھائی۔ آپ نے واقعی میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔"

اس کے لہجے میں ایک ایسی خوشگوار حیرت کی لہر دوڑ گئی جس نے سلمان کے دل کو سرشار کر دیا۔

یونہی، دونوں کے درمیان کچھ دیر مزید بات چیت جاری رہی، کبھی گہری اور کبھی ہلکی پھلکی۔ آخر کار جب گفتگو اپنے اختتام کو پہنچی، تو سلمان نے فون بند کر دیا۔ مشعل نے سکون کی گہری سانس لی۔ ایک خوشگوار سی تھکن اس کے وجود پر چھانے لگی، جیسے روح کو غذا مل گئی ہو۔ اس نے اپنا موبائل فون آہستگی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور خود کو لحاف میں سمیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ آنے والے کل کی روشن امیدیں اور سلمان کی مدد کے خوشگوار احساسات اسے نیند کی گہری وادیوں میں لے گئے، اور وہ جلد ہی پرسکون اور گہری نیند سو چکی تھی۔

..☆...☆...☆..

چنار کھیڑا کے گاؤں میں صبح کی پہلی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور شمیم اپنے والد کے ساتھ شہر کے اسکول کی جانب روانہ ہوئی۔ اس کا دل امید اور خدشے کے درمیان جھول رہا تھا، نوکری کی تلاش میں۔ والد صاحب پہلے تو تیار نہ تھے کہ بیٹی کو گھر سے دور نوکری کرنے دیں، مگر شمیم کی آنکھوں میں پختہ ارادے کی چمک اور اس کی لگن نے انہیں بالآخر قائل کر لیا تھا۔ اسکول کے پرنسپل نے شمیم کی تعلیمی قابلیت اور اس کے بات کرنے کے پُروقار انداز سے متاثر ہو کر اسے فوراً نوکری کی پیشکش کر دی۔

"تمہارے اندر وہ چمک ہے جو طالب علموں کی زندگیوں کو روشن کر سکتی ہے،" پرنسپل نے کہا تھا۔

اسکول سے باہر نکلتے ہی شمیم کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی، اس نے اپنے والد کی جانب دیکھا اور فخر سے بولی، "ابا جان، میں نے کہا تھا نا! جس کام سے قدرت نے ہمیں جوڑا ہوتا ہے، جس کے لیے ہمیں پیدا کیا ہوتا ہے، اس کام سے ہماری عزت جڑ جاتی ہے۔ ہم اس سے اپنی عزت کمانے لگتے ہیں۔ اور ٹیچنگ تو ایک ایسا شعبہ ہے جہاں ذات کا کھوٹا بھی آ جائے نا، ابا جی، وہ عزت کما جاتا ہے۔"

شمیم خاموش ہو گئی، لیکن اس کے والد کے چہرے کے تاثرات پتھرائے ہوئے تھے۔ وہ آہستگی سے بولے،

"ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ہمارا استاد عزت نہیں کما سکتا۔ وجہ کیا ہے؟ نہ وہ استاد والا کردار ہے، نہ استاد والا مزاج۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ شمیم وہاں کھڑی اپنی انگلیوں کو مروڑتی رہی، ہونٹوں کو مختلف زاویوں میں حرکت دیتی رہی۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کو اداسی کا سایہ لہرایا، باپ کی مایوسی نے دل پر بوجھ ڈالا، مگر اگلے ہی پل اس کی آنکھوں میں پھر سے ایک عزم کی چمک اور خوشی کا عکس نمایاں ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پگڈنڈی پر چل پڑی۔

چنار کھیڑا کے گاؤں میں، جہاں کی مٹی میں پنجاب کی سوندھی خوشبو رچی بسی تھی، شمیم کا وجود کسی شاداب کھیت میں لہلہاتی فصل کی مانند تھا۔ آج اس نے ہلکے نیلے رنگ کا سوتی لباس زیب تن کر رکھا تھا، جس پر دھاگے کا نفیس کام تھا، اور سر پر اسی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے، جو اس کے شانوں پر بکھری زلفوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ وہ جب اپنے والد کے ساتھ اسکول سے گاؤں کی جانب لوٹی تو گاؤں کی تنگ گلیوں سے گزرتی ہوئی، ہر بڑے

چھوٹے کو سلام کرتی، اس کی آمد پر "چھمی، چھمی" کی آوازیں ہر طرف گونجنے لگتیں۔ اس کی چال میں ایک خاص بانکپن تھا، جیسے کوئی آزاد پنچھی فضا میں پرواز کر رہا ہو۔ وہ جب چلتی تو یوں لگتا جیسے ہوا بھی اس کے قدموں کی تھپکی پر رقصاں ہو۔ گندمی رنگت پر اس کا سرو قد اور وہ بلا کی حسین، ہر نظر کو اپنی جانب کھینچ لیتی۔

وہ سڑک عبور کر رہی تھی جب اچانک ایک تیز رفتار گاڑی بجلی کی سی تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔ دل دہلا دینے والے لمحے میں شمیم کو لگا کہ اب بچنا ناممکن ہے، مگر عین وقت پر ٹائروں کی چرچراہٹ کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ شمیم کو اپنی غلطی کا احساس تھا، وہ بغیر کسی توقف کے تیزی سے دوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ گاڑی کے اندر سے، سلمان رضا گیلانی، جو پورے چنار کھیڑا اور گردونواح کے سب سے اعلیٰ ترین اور امیر ترین گھرانے کا چشم و چراغ تھا، ایک معروف کاروباری شخص اور اپنے نڈر مزاج کے لیے مشہور، جس کی ملکیت میں تقریباً پورا گاؤں آتا تھا، نے اپنی آنکھوں سے ری بین (Ray-Ban) کے گلاسز ہٹائے اور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ سلمان کے لیے اس دیہاتی لڑکی کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی، مگر پھر بھی اسے دیکھنا چاہ رہا تھا، پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے یا نہیں، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا، شمیم نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ سلمان بس اسے پیچھے سے دیکھ پایا، اس کی سبک رفتار چال کو جو لمحوں میں دھندلاتی چلی گئی تھی۔ سلمان کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی، اور اس کے ذہن میں خیال آیا، "یہ تو شہر کی لڑکیوں سے بھی زیادہ پر اعتماد ہے۔ عام طور پر تو ایسی صورتحال میں لڑکیاں خوفزدہ ہو جاتی ہیں یا معافی مانگنے لگتی ہیں۔"

شام کا گہرا دھندلکا چھا رہا تھا، جب شمیم تیزی سے قدم بڑھاتی، ارد گرد کے لوگوں سے حال احوال پوچھتی ہوئی آخر کار اس قدیم برگد کے گھنے سائے تلے پہنچی جہاں اس کی بچپن کی سہیلی بانو پہلے سے منتظر تھی۔ درخت کے پتوں سے چھن چھن کر آتی مدھم

روشنی دونوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں نے دھیمی مسکراہٹ کا تبادلہ کیا، مگر بانو کا بجھا اور مرجھایا چہرہ دیکھ کر شمیم کا دل بیٹھ گیا۔ بانو کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور ان میں نمی صاف جھلک رہی تھی۔

"کیا ہوا بانو، تو اتنی چپ کیوں ہے؟" شمیم نے نرمی سے پوچھا۔

بانو نے ایک لمبی، ٹھنڈی سانس لی جیسے دل کا سارا بوجھ نکال دینا چاہتی ہو۔ اس نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکا اور دھیمی، کانپتی آواز میں گویا ہوئی: "چھمی، میں کیا بتاؤں؟ آج پھر وہی ہوا... ملک زبیر کے گھر میں، جہاں میں کام کرتی ہوں، وہیں آج پھر اس کے دوست نے میرے ساتھ نازیبا حرکت کرنے کی کوشش کی۔ جب میں برتن دھو رہی تھی..."

بانو کی آواز مکمل طور پر ٹوٹ گئی اور وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

شمیم نے تڑپ کر بانو کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کے اندر غصے کا ایک لاوا سا پکنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا کرب چھلک آیا۔

"یہ ظلم ہے بانو! یہ سراسر ناانصافی ہے! وہ کیسے کسی کی عزت پر، کسی کی مجبوری پر ہاتھ ڈال سکتا ہے؟"

شمیم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"ہم اسے نہیں چھوڑیں گے! میں ملک زبیر سے بات کروں گی، اسے اس کے دوست کی اس نازیبا حرکت کا حساب دینا پڑے گا۔ کوئی کسی کی مجبوری کا اس طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتا!"

"نہیں چھمی، نہیں!"

بانو نے بے بسی سے شمیم کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے ایسا مت کر۔ اگر مالک کو پتہ چل گیا، تو وہ مجھے کام سے نکال دے گا۔ میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔"

بانو نے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو پونچھا۔ "میں غریب ہوں۔ میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ مجھے وہاں کام کرنا ہی پڑے گا، ورنہ روٹی نہیں ملے گی۔ مالک کے گھر میں ہی میرے بچوں کا پیٹ پلتا ہے۔"

شمیم نے بانو کی بے بسی کو محسوس کیا۔ اس کا غصہ اب گہری تشویش میں بدل رہا تھا۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بانو کا ہاتھ تھامے رہی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد شمیم نے تاسف بھرے لہجے میں کہا: "بانو، میری سونیے! کاش تو بھی پڑھی لکھی ہوتی، کاش تیرے پاس بھی کوئی اپنا ہنر ہوتا، کوئی ایسی ڈھال جو تجھے ان درندوں سے بچا سکتی، تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

پھر اس نے اپنے ہاتھ کو ہوا میں لہرایا، اس کی آواز میں اب گونج پیدا ہو گئی تھی:

"ہماری ماؤں اور بہنوں کو یہ کیوں نہیں سمجھ آتا کہ تعلیم صرف کتابوں کا علم نہیں، یہ وہ طاقت اور ڈھال ہے جو ہمیں در در کی ٹھوکروں سے بچاتی ہے۔ یہ ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔"

شمیم نے اپنی بات کو مزید کھولتے ہوئے بانو کی آنکھوں میں دیکھا:

"خواہ طلاق ہو جائے، شوہر کا انتقال ہو جائے، کوئی حادثہ پیش آ جائے، یا پھر قسمت کی ستم ظریفی سے معاشی تنگی آ گھیرے، اگر اپنا ہنر ہو، اپنا پکا روزگار ہو، تو ہمیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے یا مجبوری میں نوکرانیوں کی طرح گھر گھر جا کر کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب عورت اپنے بل بوتے پر ہوتی ہے، جب اس کے پاس اپنی کمائی کا ذریعہ ہوتا ہے، تو پھر ہمارا سر فخر سے بلند ہوتا ہے اور کوئی مائی کا لال ہمیں حقیر نظروں سے

دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ یہ تعلیم اور ہنر ہی تو خود مختاری کی کنجی ہے! یہ وہ روشن چراغ ہے جو ہر تاریک راستے کو منور کر سکتا ہے۔"

شمیم کی باتوں میں ایک ایسا سچ تھا، ایک ایسا اٹل عزم جو نہ صرف بانو بلکہ ہر اُس لڑکی کے لیے مشعلِ راہ بننا چاہتا تھا جو آج بھی صدیوں پرانے، بندھے ٹکے رواجوں کی زنجیروں میں جکڑی تھی۔ اس کی آواز شام کی خاموشی میں گونج رہی تھی، جیسے وہ ہر اُس دل کو جگا رہی ہو جو روشنی کا منتظر تھا۔ بانو شمیم کی باتیں سنتی رہی اور شمیم اس کی حالت زار پر غور کرتی رہی۔ وہ دل ہی دل میں عہد کر چکی تھی کہ بانو کے لیے انصاف حاصل کرے گی، چاہے اس کے لیے اسے کوئی بھی قدم اٹھانا پڑے۔

..☆...☆...☆..

مشعل کے چہرے پر اطمینان کی ایک گہری مسکراہٹ پھیل گئی، جو اس کی روح میں رچے ہوئے سکون کی عکاس تھی۔ اسے وہ لمحہ یاد آیا جب اس نے ہدیٰ ایسوسی ایٹس کے وسیع دالان میں قدم رکھا تھا، ایک ایسا دفتر جو اپنے اندر قانون کی گونج اور کامیابیوں کی داستانیں سموئے ہوئے تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بیرسٹر ہدیٰ انصاری، جو قانونی دنیا میں ایک قد آور شخصیت سمجھی جاتی تھیں، ایک بار پھر تازہ خون کی تلاش میں تھیں—ایسا خون جو ان کی قانونی میراث کو آگے بڑھا سکے، جو ان کی ٹیم کا حصہ بن کر قانونی میدان میں نئی مثالیں قائم کر سکے۔ ہدیٰ صاحبہ، اپنی غیر معمولی بصیرت کے ساتھ، اس بار اپنی ٹیم کی تشکیل اور ٹریننگ کا عمل خود دیکھ رہی تھیں، ہر فرد کا انتخاب ذاتی لگن اور گہری چھان بین کے بعد کر رہی تھیں۔

ایک ہفتہ قبل کا منظر مشعل کی نگاہوں میں اس طرح گھوم رہا تھا جیسے وہ ابھی کل کی بات ہو۔ وہ ہدیٰ انصاری کے سامنے ایک پر عزم اور پر اعتماد انداز میں بیٹھی تھی، جس کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب اور ذہن میں قانونی چیلنجز کا سامنا کرنے کی لگن واضح تھی۔ کیس کی تمام تفصیلات اس کی انگلیوں پر رقص کر رہی تھیں، ہر قانونی نکتہ اس کے ذہن میں ایک شفاف تصویر کی صورت موجود تھا۔ ہدیٰ صاحبہ نے جب پیچیدہ سے پیچیدہ سوالات داغے، تو مشعل نے ہر سوال کا جواب نہ صرف قانون کی کتابوں سے نکال کر دیا بلکہ اپنے فطری تجزیاتی ذہن کا بھی خوب ثبوت دیا۔ اس کا انداز بیان ایسا تھا کہ ہر جواب کے ساتھ ہدیٰ انصاری کی گہری، تجربہ کار آنکھوں میں ایک چمک بڑھتی جاتی تھی — یہ چمک صرف ذہانت کی نہیں بلکہ ممکنہ کامیابی کی نوید تھی۔

آخر کار، ایک طویل، پر معنی مکالمے کے بعد، ہدیٰ انصاری نے اپنے مخصوص، دھیمے مگر پر اثر لہجے میں کہا تھا:

"مشعل، آپ کی لگن اور قانونی سمجھ متاثر کن ہے۔ ہمیں اپنی ٹیم میں ایسے ہی نوجوان، باصلاحیت اور پر جوش وکلاء کی ضرورت ہے، جو قانون کے شعبے میں ایک نیا باب رقم کر سکیں۔"

یہ الفاظ مشعل کے لیے صرف ایک تعریف نہیں تھے، بلکہ اس کے تمام تر خوابوں، محنتوں اور قربانیوں کا اعتراف تھے۔

آج صبح جب اسے ہدیٰ ایسوسی ایٹس کی جانب سے باضابطہ پیشکش کا خط ملا، تو مشعل کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ صرف ایک نوکری نہیں تھی؛ یہ اس کے خوابوں کی تعبیر تھی، برسوں کی جدوجہد کا ثمر۔ وہ جانتی تھی کہ ہدیٰ انصاری جیسی قد آور اور تجربہ کار وکیل کے ساتھ کام کرنا اس کے کیریئر کے لیے ایک بہترین اور بے مثال موقع ثابت ہو گا۔ یہ اس کی پریکٹس کا آغاز تھا، ایک نئے سفر کا نقطۂ آغاز جہاں چیلنجز کے ساتھ ترقی

اور کامیابی کے لامحدود امکانات تھے۔ مشعل اس چیلنج کو قبول کرنے اور اپنی قابلیت کا لوہا منوانے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ اس کے دل میں ایک نیا ولولہ اور آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی، جو اسے آنے والے روشن مستقبل کی طرف لے جا رہی تھی۔

..☆...☆...☆..

وہ لمحہ آن پہنچا تھا جب شہر کی کشش سلمان کو اپنی جانب کھینچ رہی تھی، مگر اس کے دل کا ایک ٹکڑا دادی کے پاس رہ جانے پر بضد تھا۔ کمرے میں پھیلی سامان کی بو اور آخری شرٹس کی تہہ بندی، سب کچھ اس الوداعی گھڑی کا اشارہ دے رہا تھا۔ دل پر ایک انجانا سا بوجھ تھا، دادی سے جدائی کا خیال ہی اسے بے چین کر دیتا تھا۔ انہی گہری سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر دادی کی وہ کھنکتی ہوئی آواز گونجی، جو عمر کی قید سے آزاد، ہمیشہ کی طرح شوخ اور چنچل تھی۔

"اوئے میرے ہینڈسم! اکیلا ہی سارا بوجھ اٹھائے گا؟ اپنی بوڑھی دادی کو بھول گیا؟"

دادی، اپنی مخصوص شان سے، ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں میں سوجی کی مٹھائی سے بھری پیالی تھی جس کی دلنشین خوشبو پورے کمرے میں پھیل گئی۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی نکھری نکھری، سجی سنوری لگ رہی تھیں، جیسے ان کے ہر انداز میں سلمان کو خوش کرنے کی چاہت چھپی تھی۔

سلمان پلٹا، اس کے ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔

"میری گرل فرینڈ! آج تو کمال لگ رہی ہو، کسی فلمی ہیروئن سے کم نہیں۔ کیا ارادہ ہے؟ آج بھی کسی کو کلین بولڈ کرنا ہے؟"

اس نے شرارت سے دادی کی طرف دیکھا، جیسے کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے ناز کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور شرارت کی ایک انوکھی چمک تھی۔

دادی نے ایک مصنوعی غصے سے اس کے کندھے پر تھپکی دی، جس میں پیار کی شیرینی گھلی تھی۔ "دفع ہو جا! تیرا دادا ابا بھی ایسے ہی چھیڑتا تھا اور اب تو بھی شروع ہو گیا ہے۔ ویسے تو سچ کہہ رہا ہے، میری جوانی میں تو بڑے بڑے جوان کلین بولڈ ہوتے تھے۔"

انہوں نے فخر سے اپنی چمکتی آنکھوں سے سلمان کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں ماضی کی حسین یادیں رقص کر رہی تھیں۔

"پر تجھ سا عاشق آج تک نہیں دیکھا میں نے۔"

ان کا لہجہ ممتا بھری فخر سے لبریز تھا۔

سلمان ہنس پڑا۔

"آپ بھی نہ دادی! میری تو قسمت ہی خراب ہے کہ آپ نے خود کو ہی میری گرل فرینڈ بنا کر رکھا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مجھے کسی اور کی طرف دیکھنے ہی نہیں دیا۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا، اس کے لہجے میں محبت بھری شکایت تھی، جیسے وہ اپنی محبوبہ سے دل کے راز کہہ رہا ہو۔

دادی کا ہنستا چہرہ ایک لمحے کو سنجیدہ ہوا، جیسے کوئی گہری بات یاد آئی ہو، پھر ان کے ہونٹوں پر دوبارہ وہی دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے مٹھائی کی پیالی سلمان کو پکڑی اور اس کے کندھے پر پیار سے تھپکی دی۔

"اوئے پاگل! یہ کیا باتیں کر رہا ہے؟"

ان کی آواز میں شوخی کی ایک نئی لہر تھی۔

"تیرے جیسا ہینڈسم اور ذہین لڑکا بھلا اکیلا کیسے رہ سکتا ہے؟ تو بس دیکھتا جا، جب تیرے لیے میں کوئی ہیروئن تلاش کروں گی نا، تو تو ساری فلمیں بھول جائے گا۔" دادی نے آنکھ ماری۔

سلمان نے مصنوعی ناراضگی سے کہا،

"پر آپ کے نخرے؟ آپ کو آپ کی بہو یا کوئی اور برداشت بھی تو نہیں کر سکتا۔"

دادی نے ایک دلکش قہقہہ لگایا، جس سے کمرہ گونج اٹھا۔

"ہاں نخرے تو ہیں میری جان! اور وہ اس لیے ہیں کہ تجھے چھیڑ سکوں۔ بھلا تجھے چھیڑنے کا موقع کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟"

انہوں نے سلمان کا ہاتھ تھاما، ان کی آنکھوں میں ایک حسین خواب چمک رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے پتر، جب تو شہر سے واپس آئے گا تو یہ گھر پھر سے ہنسنے لگے گا۔ پر ایک بات یاد رکھ، تیری دادی کے نخرے کچھ وکھرے ہیں۔ ان کو برداشت کرنے والا بھی کوئی وکھرا ہی ہو گا نا!"

انہوں نے سلمان کے گال پر پیار سے ایک چٹکی بھری۔

سلمان نے دادی کا ہاتھ تھام کر اپنے دل سے لگا لیا۔ "دادی، آپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ آپ کے نخرے اٹھانے والا آپ کا یہ پوتا ابھی زندہ ہے۔"

اس نے پیار سے دادی کے جھریوں بھرے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور رضا گیلانی کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ سلمان کے والد تھے، اور ان کے چہرے پر بھی وہی دادی والی چمک اور رکھ رکھاؤ تھا، بس عمر کے ساتھ کچھ سنجیدگی بھی در آئی تھی۔

"لگتا ہے میرے بیٹے کا بوریا بستر بندھ گیا ہے، اور ماں جی کی جذباتی گفتگو ابھی جاری ہے۔"

رضا نے ہنستے ہوئے کہا، ان کی آواز میں محبت اور چھیڑ چھاڑ کا وہی انداز تھا جو دادی اور سلمان میں جھلکتا تھا۔

سلمان نے والہانہ انداز میں والد کو گلے لگایا۔

"ابو! آپ کو پتا ہے میری گرل فرینڈ! یہ تو مجھے جانے ہی نہیں دیتیں۔"

رضا نے دادی کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ "ماں جی، آپ کا یہ لڑکا اب شہر اپنے کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہے، اس کو روکو نہیں، اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کرو۔"

دادی نے پیار سے سلمان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں، شاید جدائی کا احساس اب انہیں بھی چھو چکا تھا۔

"جا پتر، رب راکھا۔ اور ہاں! میری بہادری یاد رکھی۔ تیرے میں جو دلیری ہے، وہ میری دین ہے۔"

ان کے الفاظ میں ایک مٹھاس تھی، جیسے وہ اپنی تمام محبت اور اپنا سارا تجربہ سلمان کے لیے نچوڑ رہی ہوں۔

سلمان گاڑی میں بیٹھا اور دادی کو دیکھا۔ رضا گیلانی، جو اسے چنار کھیڑا سے شہر چھوڑنے جا رہے تھے، ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوئے۔ گاڑی اب روانہ ہونے کو تھی اور دادی برآمدے میں کھڑی، مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر ان کے چہرے پر ہنسی اور اداسی کا وہ ہی انوکھا امتزاج تھا—ایک ایسا امتزاج جو صرف دادی اور پوتے کے رشتے میں ہی مل سکتا ہے۔ سلمان نے ہاتھ ہلایا، اور ان کا ہنستا، روتا چہرہ پیچھے چھوڑتا ہوا چنار کھیڑا سے شہر کی طرف چل پڑا، اپنے پیچھے ایک انمول رشتہ، محبت اور چھیڑ چھاڑ کا حسین

بندھن چھوڑ گیا۔ یہ محض ایک جدائی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسے رشتے کی گواہی تھی جو وقت اور فاصلے سے ماورا تھا۔

گاڑی جیسے ہی تھوڑی آگے بڑھی، دادی نے یاد دلانے والے انداز میں آواز دی،

"اور ہاں، رضا! ذرا مشعل کو بتا دینا کہ دادی اسے یاد کر رہی تھی، اور یہ بھی کہ اس کی وکالت کا یہ پہلا سال کیسا جا رہا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے ہاتھ ہلایا اور ان کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سلمان کا دل ایک بار پھر دادی کی محبت سے سرشار ہو گیا، اور ان کی گاڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

..☆...☆...☆..

گاؤں کے چوپال میں ملک زبیر اپنی گاڑی کے بونٹ پر اکڑ کر بیٹھا تھا، اس کے ارد گرد اس کے دوستوں کا ہجوم تھا۔ ان کی ہنسی کی آوازیں دور دور تک پھیل رہی تھیں جو بانو کی سسکیوں پر بھاری پڑ رہی تھیں۔ بانو، ایک کم عمر لڑکی، سر جھکائے، خوفزدہ کھڑی تھی اور اس کے ہونٹوں سے بمشکل سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ تنہا تھی اور ملک زبیر کے گھر میں کام کرتی تھی، جس کا مطلب تھا کہ اس کی زندگی ملک زبیر کے رحم و کرم پر تھی۔ ملک زبیر کے ہاتھوں میں ایک لکڑی تھی جسے وہ اچھال اچھال کر بانو کو مزید ڈرا رہا تھا۔ اس کے دوست بھی قہقہے لگا رہے تھے اور بانو کی بے بسی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے چھو کر، آوازیں کس کر مزید ہراساں کر رہے تھے۔ بانو کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ مدد کے لیے چاروں طرف دیکھ رہی تھی لیکن کوئی اس کی مدد کو آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔

شمیم، جو تھوڑی دور کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی، اس کا خون کھول اٹھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ بانو جیسی معصوم لڑکی کو یوں سرِ عام ذلیل کیا جائے۔ بانو کی سسکیاں اور اس کی خوفزدہ نظریں شمیم کے دل میں پیوست ہو رہی تھیں۔ شمیم کی مٹھی بھینچ گئی اور اس کے چہرے پر ایک عزم نمایاں ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ ملک زبیر گاؤں کا امیر اور بااثر زمیندار ہے، جس کے سامنے کوئی آواز اٹھانے کی جرات نہیں کرتا، لیکن اس وقت اسے اپنی پرواہ نہیں تھی۔

وہ ایک لمحے کے لیے بھی رکی نہیں اور بانو کی طرف بڑھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر اس کے قدم مضبوط اور ارادے اٹل تھے۔ اس نے ملک زبیر کے قریب پہنچ کر ایک گہری سانس لی اور پوری طاقت سے آواز بلند کی۔

"تم لوگ درندے ہو! حیوان!" شمیم کی آواز فضا میں گونجی۔

"تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی؟ ایک بے گناہ لڑکی کو یوں رسوا کرتے ہوئے؟"

ملک زبیر، جو اپنی بدمعاشی میں مگن تھا، شمیم کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ ایک شیطانی چمک بھی نمودار ہوئی۔ اس کے دوست بھی اپنی ہنسی روک کر شمیم کو گھورنے لگے۔ ملک زبیر، جو گاؤں کا جانا مانا امیر اور زمیندار تھا، کسی کی جرات پر حیران تھا کہ کوئی اس کے سامنے آواز بلند کرے۔ بانو اور شمیم جیسی گاؤں کی غریب لڑکیاں اس کے لیے محض ایک کیڑے کی حیثیت رکھتی تھیں جنہیں وہ جب چاہتا روند سکتا تھا۔

"اوہو! یہ کون سی نئی حسینہ ہے جو اتنی تیزی دکھا رہی ہے؟"

ملک زبیر نے ایک خبیث مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لگتا ہے تمہیں بھی بانو کی طرح سبق سکھانے کی ضرورت ہے!"

شمیم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، اس کی نظروں میں نہ کوئی خوف تھا اور نہ ہی کوئی جھجک۔

"میں بانو نہیں ہوں، جو تمہارے سامنے سر جھکا دوں گی۔ میں شمیم ہوں اور میں تمہاری بدمعاشی کو بے نقاب کروں گی!"

اس کی آواز میں گاؤں کی ان تمام مظلوم لڑکیوں کی گونج تھی جنہیں ملک زبیر جیسے ظالموں نے ہمیشہ حقیر سمجھا تھا۔

اس کے الفاظ ملک زبیر اور اس کے حواریوں کے لیے کسی چیلنج سے کم نہ تھے۔ ان کی آنکھوں میں غصہ اور نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی، پھر ملک زبیر کے ایک دوست نے ایک کرخت لہجے میں کہا،

"اس لڑکی کی ہمت تو دیکھو! اسے تو مزہ چکھانا پڑے گا!"

شمیم نے ایک سرد نگاہ ان سب پر ڈالی اور غرور سے سر اٹھا کر بولی،

"تم لوگوں کی اوقات ہی کیا ہے؟ تم صرف بزدل اور نامرد ہو۔"

یہ کہتے ہوئے شمیم نے بانو کا ہاتھ پکڑا جو ابھی تک لرز رہی تھی اور اسے اپنے ساتھ کھینچنے لگی۔ ملک زبیر کے دوستوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی، ان پر پھبتیاں کسیں، مگر ملک زبیر نے ایک سرد اشارے سے انہیں روک دیا اور شمیم اور بانو کو وہاں سے جانے دیا۔ اس کی نظروں میں ایک خاموش عہد تھا:

شمیم کو اس کی جرات کی قیمت چکانی پڑے گی۔ شمیم جانتی تھی کہ اس کی یہ بے باکی اب اسے ایک نئے طوفان کی زد میں لے آئے گی۔ ملک زبیر اور اس کے حواریوں کی تمام توجہ اب بانو سے ہٹ کر پوری طرح شمیم پر مرکوز ہو چکی تھی۔

..☆...✯...☆..

ایک سرد، بے رنگ شام تھی جس کا سناٹا چار سو پھیلا ہوا تھا۔ مشعل کے دفتر سے ہزاروں میل دور، شفق کے گھر میں بھی اسی طرح کی گھٹن محسوس کی جا سکتی تھی۔ صحن میں، پھیکی روشنی کے جھروکے میں، سمیرا گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے یوں بیٹھی تھی جیسے اس کا اپنا وجود ہی اس کے بے کراں غم کا بوجھ بن چکا ہو۔ آنکھیں نم تھیں مگر سسکیاں اس نے حلق میں ہی گھونٹ رکھی تھیں۔ ماضی کی سرگوشیاں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں، جہاں اس کی زندگی کا ایک کڑوا سچ کسی ناسور کی طرح چھپا تھا۔

سمیرا کے ذہن میں لہریں بناتا وہ خیال، جو اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر رہا تھا:

"امی، آپ تو جانتی ہیں میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں!" اس کی آواز میں ایک التجا تھی جو دل چیر رہی تھی۔

"تمہاری پسند تمہارے باپ کی عزت سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔"

ماں کا دوٹوک، پتھر جیسا لہجہ سمیرا کے دل پر ہتھوڑے کی طرح گرا۔ ایک لمحے کو جیسے اس کی دھڑکن تھم سی گئی، وہ خاموش ہو گئی۔

پھر، تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد، ایک ٹھنڈی خبر اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتری۔ "تمہارے باپ نے اس مہینے کی آٹھ تاریخ کو تمہاری رخصتی طے کر دی ہے۔"

"امی! انکار کا اختیار ابھی بھی ہے میرے پاس،" سمیرا کی آواز میں امید کی ایک مدھم سی لہر لرزش کر رہی تھی۔

"اگر ایسا ہو گیا تو کیا عزت رہ جائے گی ابو کی؟"

ماں نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو نگلتے ہوئے کہا،

"سمیرا! آج تک گھر کا ہر فیصلہ تمہارے ابو نے ہی کیا ہے۔"

"عورت کو بولنے کا اختیار کبھی دیا ہی کب ہے اس گھر میں؟" سمیرا نے بے بسی سے جیسے خود کلامی کی۔

اس کی ماں اب خاموش تھی، اس کی نظریں خلا میں جمی تھیں، جیسے وہ اپنی بیٹی کی بے بسی کو محسوس کر رہی ہو۔

"امی! جس دور میں، میں رہتی ہوں نا، اس دور کی لڑکیاں جینز اور ٹی شرٹ پہن کر آزادی سے گھومتی ہیں۔ اور میں؟" سمیرا کی آواز میں درد بڑھتا گیا۔

"میں اس گھٹن زدہ ماحول میں سانس لے رہی ہوں جہاں زبان، آنکھ، کان سب بند کر کے رہنا پڑتا ہے۔ اجازت ہے تو صرف سانس لینے کی۔ آج یہ خبر سنا کر تو آپ نے سانس لینے کا بھی حق چھین لیا ہے مجھ سے۔"

اس کی ماں اب بھی خاموش تھی، سرد نگاہیں دور کسی نقطے پر مرکوز کیے وہ یوں سن رہی تھیں، جیسے وہ خود بھی اسی قید کی زنجیروں میں جکڑی ہو۔

"امی! اسلام نے مرد کو جائیداد کا حقدار بنایا ہے، لیکن وہ عورت کے حقوق پر زمینی خدا بن کر بیٹھ گیا ہے۔ کیا اسلام نے عورت کو اپنی پسند کا اختیار نہیں دیا؟"

"کس کی شہہ پر تم اپنے باپ کے خلاف اتنا بڑھ چڑھ کر بولنے لگ گئی ہو سمیرا؟" سمیرا کی امی نے پہلی دفعہ سوال کیا، ان کی آواز میں ناگواری کے ساتھ تاسف بھی تھا۔

"اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی امی، آپ کو لگتا ہے کہ میں کسی کی شہہ پر بول رہی ہوں۔ اس سے تو اچھا تھا پیدا ہوتے ہی مجھے دفنا دیتے آپ لوگ،" سمیرا نے اپنے درد کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔

اچانک ایک نرم ہاتھ نے سمیرا کے کندھے کو چھو کر اس کی غمی کا طلسم توڑ دیا۔ سمیرا نے چونک کر سر اٹھایا تو سامنے شفق کھڑی تھی، اس کی آنکھوں میں ہمدردی اور گہری فکر جھلک رہی تھی، شفق نے سمیرا کی آنکھوں کی نمی دیکھی تو اسے سمجھ آگیا کہ سمیرا ابھی بھی اپنے ماضی کے دکھوں میں گھری ہوئی ہے۔

سمیرا نے سسکیاں بھرتے ہوئے شفق کو گلے لگایا اور بے اختیار رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں اس کی روح کی چیخیں تھیں۔

"شفق آپی، ایک جوان اولاد کو ماں باپ بیس پچیس سال پالتے پوستے ہیں، اس کے لیے نہ جانے کتنی قربانیاں دیتے ہیں، اپنے خوابوں کو تیاگ دیتے ہیں تاکہ ان کی اولاد ایک خوشگوار زندگی گزار سکے۔ مگر اکثر یہی ہوتا ہے کہ لڑکیاں محض ایک دو سال یا چند مہینوں کی محبت کے سامنے ان بیس پچیس سال کی محبت اور قربانی کو فراموش کر دیتی ہیں۔ اپنی پسند میں بھاگ کر اپنی مرضی کر لیتی ہیں اور یہ نہیں سوچتیں کہ ان کے اس ایک فیصلے سے والدین کا کیا بنے گا، ان کی عزت اور وقار کیسے پامال ہو گا؟" سمیرا کی آواز میں گہرا پچھتاوا تھا۔

جونہی اس کی بات کا تار ٹوٹا، سمیرا شفق کے آغوش میں سمٹ گئی اور اس کی ہچکیوں نے جیسے روح کی چیخوں کا روپ دھار لیا۔ ہر سسکی فضا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی، ٹھیک اسی طرح جیسے صحن کے کنارے سلگتے سگریٹ کا دھواں ہوا میں گھل رہا تھا۔ اس کی نم آنکھیں بے ساختہ صحن میں ساکت کھڑے ایک مبہم سائے پر جا ٹکیں۔ چہرہ واضح نہ تھا، مگر زبان سے بے اختیار "احمر بھائی!" پھسل پڑا۔ شفق کے سہارے سے ہٹ کر وہ لرزتی ہوئی پیچھے سرک گئی۔

احمر، جو شفق کا شریک حیات تھا، سمیرا کو اشکوں سے تر دیکھ رہا تھا۔ سمیرا کی سسکیوں کی بازگشت اس کے سماعتوں میں یوں گونج رہی تھی، جیسے اس کے اپنے دل کے نہاں خانوں میں بھی کسی اَن کہے دکھ کی چاپ سنائی دے رہی ہو۔

:

مشعل کے دفتر میں کھڑکی سے چھن کر آتی پھیکی روشنی نے میز پر بکھرے کاغذات کو مزید بے جان بنا دیا تھا۔ یہ اس کے وکالت کے کیریئر کا آغاز تھا، اور ہر نیا موڑ ایک تازہ آزمائش بن کر سامنے کھڑا تھا۔ آج بھی ایک ایسا ہی کیس اس کے سامنے پڑا تھا—ایک ہاری ہوئی جنگ، مگر مشعل کے لیے گہرے زخم کی سی کسک۔ اس کے سامنے بیٹھی سینئر وکیل نازیہ رحمن کی آواز میں تھکن اور برسوں کے تجربے کی گہرائی گھلی ہوئی تھی، جو ان کی آنکھوں میں جھلکنے والے لاتعداد کیسز کی داستان سنا رہی تھی۔

"مشعل، میں جانتی ہوں یہ کیس کتنا مشکل ہے،" نازیہ رحمن نے نرمی مگر پختگی سے سمجھایا۔

"وہ لڑکی گھر سے بھاگ کر شادی کر چکی ہے۔ معاشرہ اسے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ عموماً گھریلو جھگڑے اور مار پیٹ کے کیسز تو کسی نہ کسی طرح سلجھ جاتے ہیں، مگر یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ قانونی طور پر اس کی گتھی سلجھانا انتہائی پیچیدہ ہے۔ لڑکی کے پاس نہ کوئی مضبوط پشت پناہ ہے اور نہ ہی مالی وسائل۔ اس کے برعکس، شوہر کے پاس اثر و رسوخ بھی ہے اور بینک بیلنس بھی۔ ثبوت نہ ہونے کے برابر ہیں، یہ کیس کسی بھی وکیل کے لیے ایک بڑی قانونی رکاوٹ ہے۔ کوئی بھی یہ کیس لینے کو تیار نہیں، تم بھی نہ لو تو بہتر ہے۔"

مشعل کی نظریں میز پر پڑے کیس پیپرز پر مرکوز تھیں، جہاں ساس اور شوہر کے ظلم و ستم کی ہوش ربا کہانیاں درج تھیں۔ جسمانی اور جذباتی تشدد کی وہ تفصیلات جنہیں پڑھتے

ہوئے بھی روح کانپ اٹھتی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ ان تمام کاغذات کو پھاڑ دے، اور اس ظلم کی داستان کو ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔ یہ سب پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بہن زرمین کا چہرہ گھوم گیا۔ زرمین بھی تو کچھ ایسے ہی حالات سے گزری تھی، اور اس کی یادیں ایک کڑوی گولی کی طرح حلق میں پھنس کر مشعل کا دل بے چین کر گئیں۔

"یہ کیس نہیں، یہ ایک جان کا معاملہ ہے۔"

مشعل نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

اسے اپنی بہن زرمین کی خاموش چیخیں اس لڑکی کے کیس میں سنائی دے رہی تھیں۔

جس لڑکی نے اپنی محبت کے لیے سب کچھ داؤ پر لگایا، اسے سہاگ کے نام پر جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اور پھر، اس کی بیٹی...! پیٹ میں ہی دم توڑ دینے والی معصوم بچی!

یہ سطر پڑھتے ہی مشعل کے ہاتھ کانپنے لگے، اس کی آنکھیں غم اور غصے سے نم ہو گئیں۔

یہ سارا احساس، محبت اور زرمین کی یاد کے گہرے تعلق سے جنم لینے والی ایک ایسی آگ تھی جس نے اس کے اندر ایک نیا عزم بیدار کر دیا تھا۔

یہ صرف ایک کیس نہیں تھا، یہ ایک ماں کے دل کا خون تھا جو اس کے سامنے بہہ رہا تھا۔

یہ ظلم کی انتہا تھی، اور اس کا دل چیخ اٹھا کہ اسے کسی بھی قیمت پر انصاف دلانا ہے۔

اس نے گہرا سانس لیا اور اپنی نظریں نازیہ رحمن کے چہرے پر جما دیں۔ اس کی آواز میں غیر معمولی عزم تھا۔

"مجھے معلوم ہے، یہ مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے۔ قانونی پیچیدگیاں اپنی جگہ، لیکن یہ صرف ایک کیس نہیں ہے۔ یہ میرے لیے ذاتی جنگ ہے۔ یہ میرے ضمیر کا بوجھ ہے نازیہ میم۔ یہ ایک آواز ہے جو خاموش نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ایک لڑکی کا حق ہے جو اسے

ملنا چاہیے۔ اور سب سے بڑھ کر، یہ ایک بیٹی کا حق ہے جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی چھین لیا گیا۔"

اس کی آواز لرز رہی تھی مگر اس میں ٹوٹی ہوئی ہچکیوں کی جگہ ایک چٹان سا پختہ ارادہ تھا۔

"کوئی یہ کیس لے یا نہ لے، میں اسے لڑوں گی۔ چاہے سب میری مخالفت کریں، میں اس لڑکی کو انصاف دلواؤں گی۔ یہ صرف ایک کیس نہیں ہے، یہ میرا فرض ہے!"

نازیہ رحمن نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ مشعل کی آنکھوں میں لہراتی روشنی، یہ نیا جنون جو اس نے آج تک مشعل میں نہیں دیکھا تھا۔ اسے لگا کہ یہ کوئی عام وکیل نہیں، بلکہ ایک ایسی جنگجو ہے جو میدان میں تنہا کھڑی، اپنے اصولوں اور سچائی کے لیے لڑنے کو تیار ہے۔

:

مشعل کے دفتر میں نازیہ رحمن ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ ایک مدھم سی دستک پر دروازہ کھلا اور ایک نحیف و نزار لڑکی دہلیز عبور کر اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ خوف اور تھکن سے اس قدر بوجھل تھا جیسے برسوں کی نیند اس سے روٹھ گئی ہو۔ آنکھوں میں بے یقینی کے سائے گہرے تھے اور جسم محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ یہ سمیرا تھی، وہی سمیرا جس کا کیس مشعل کے دل میں ایک طوفان برپا کر چکا تھا۔

سمیرا کو اس حالت میں دیکھ کر مشعل کا دل ایک بار پھر پسیج گیا۔ اس کے وجود سے بدحالی چیخ چیخ کر اپنا حال سنا رہی تھی۔ نازیہ رحمن نے سمیرا کا تعارف کروایا اور اسے مشعل کے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مشعل نے نرمی سے اسے پانی پیش کیا اور اپنی دھیمی آواز میں اسے یقین دلایا کہ وہ یہاں بالکل محفوظ ہے۔ سمیرا نے ڈرتے ڈرتے ایک نظر مشعل پر ڈالی اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

"سمیرا، جو کچھ بھی تم پر بیتا ہے، مجھے سب تفصیل سے بتاؤ تاکہ میں تمہیں انصاف دلانے میں تمہاری مدد کر سکوں۔ بے خوف ہو کر ہر بات کہو۔" مشعل نے پر اعتماد مگر شفیق لہجے میں کہا۔

سمیرا نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کے کانپتے ہونٹوں سے ماضی کا کرب ناک افسانہ قطرہ قطرہ ٹپکنے لگا۔

"میرا باپ... وہ انتہائی سخت مزاج تھا۔ میری ماں کو معمولی باتوں پر بھی مار پیٹ کا نشانہ بناتا تھا۔ گھر میں ہر وقت ایک خوف کی فضا طاری رہتی۔ مجھے کبھی آزادی محسوس نہیں ہوئی، دل کرتا تھا کہ کسی طرح اس قید سے نجات مل جائے۔"

اس کی آواز میں ماضی کا خوف نمایاں تھا۔

"پھر... مجھے کاشف سے محبت ہو گئی، مگر میں جانتی تھی کہ میرا باپ کبھی محبت کی شادی کی اجازت نہیں دے گا۔ اسے محبت جیسے رشتے سے ہی نفرت تھی۔ اسی لیے میری چھ ماہ کی محبت میرے والدین کی تیئس سال کی محبت پر غالب آ گئی، اور میں نے بغیر سوچے سمجھے گھر سے بھاگ کر کاشف سے شادی کر لی۔"

اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا، جیسے وہ اپنے اس فیصلے کی گہرائی کو ماپ رہی ہو۔

"مجھے لگا تھا کہ میں نے اس قید سے آزادی حاصل کر لی ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"مگر... آزادی کی یہ قیمت بہت بھاری پڑی۔ کاشف کا گھر... وہ تو اس سے بھی بڑی قید نکلا۔ میری ساس... اس کا رعب اور دھونس اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ مجھے ہر بات پر طعنے دیتی، گالیاں بکتی۔ کبھی کھانا ٹھیک نہ بنتا تو گرم سالن مجھ پر ڈال دیتی، کبھی چائے گر جاتی تو کھولتی چائے میرے ہاتھ پر گرا دیتی، برتن دھوتے ہوئے ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو کرنٹ لگانے کی دھمکی دیتی، اور معمولی سی بات پر طمانچے رسید کر دیتی۔ اس کی زبان

سے نکلنے والے الفاظ نہیں، آگ کے انگارے تھے جو میرے جسم وروح کو جھلساڈالتے تھے۔ایک دن تو... ایک دن تو اس نے میرا ہاتھ چولہے پر رکھ دیا اور کہتی تھی کہ جب تک تو اس گھر میں ہے، ایسے ہی تجھے سزا ملے گی۔"

سمیرا کا چہرہ درد سے بگڑ گیا۔

"کاشف بھی... شروع میں تو اچھا تھا، لیکن پھر وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ مل گیا۔مجھے مارتا پیٹتا تھا۔" اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے بازو پر پڑی ایک پرانی چوٹ کو چھوا۔

"پھر مجھے پتا چلا کہ میں امید سے ہوں۔میری بیٹی تھی..." اس کی آواز گھٹ گئی۔

"جب انہیں پتا چلا کہ پیٹ میں لڑکی ہے، تو انہوں نے زبردستی میرا حمل ضائع کروادیا۔ میری ساس نے مجھے پیٹ پر اتنی زور سے لات ماری کہ میں سیڑھیوں سے لڑھک گئی، میرا جسم ہر سیڑھی پر ٹکراتا چلا گیا، اور میرے پیٹ میں ہی بچی کا دم گھٹ گیا۔میرا خون بہنے لگا تھا، ہر طرف لال رنگ تھا، میری اپنی بیٹی جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی قتل کر دی گئی تھی۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک اور بیٹی اس گھر میں آئے۔"

اس کے آنسو بے اختیار بہنے لگے تھے۔

مشعل کی آنکھوں میں نمی سی چھا گئی تھی، جسے چھپاتے ہوئے اس نے گہری سانس لی اور سمیرا کو حوصلہ دیا۔

"مجھے پتہ تھا کہ اب میں وہاں نہیں رہ سکتی تھی، مگر واپس کہاں جاتی؟" سمیرا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"جب میں گھر سے بھاگی تھی، تو کچھ عرصے بعد مجھے اطلاع ملی کہ میرے باپ نے میری ماں کو طلاق دے دی تھی اور اس کے کچھ عرصے بعد ہی وہ خود بھی انتقال کر گئے تھے۔ میرا گھر ٹوٹ چکا تھا، ماں بے سہارا ہو چکی تھی، اور اب باپ بھی نہیں رہے۔اب میں نہ گھر جا سکتی تھی اور نہ ہی اپنی ماں کے پاس، کیونکہ وہ بھی طلاق کے بعد اپنی ماں کے گھر

چلی گئی تھیں، اور میری حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مجھے اپنے گھر میں پناہ دے سکیں۔
میں ہر طرف سے تنہا اور بے سہارا تھی، مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔"
سمیرا کی آواز میں بے بسی اپنے عروج پر تھی۔
"ایک دن... کاشف مجھے ایک کپل پارٹی میں لے گیا۔ وہاں کاشف کے دوست اپنی بیویوں پر ایسے تبصرے کر رہے تھے جیسے وہ کوئی چیز ہوں۔ میرے شوہر (کاشف) نے بھی ان باتوں کو ہنسی میں اڑا دیا اور جب میں نے انہیں ٹوکنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پارٹی کے دوران، جب میں تھوڑی دیر کے لیے اکیلی ہوئی تو کاشف کے کچھ دوست میرے قریب آ گئے، انہوں نے مجھے ہراساں کرنا شروع کر دیا، میرے جسم کے قریب آنے کی کوشش کی اور... اور...!"
سمیرا کی آواز گلے میں گھٹ گئی، اس کا جسم کانپنے لگا۔ آنکھوں میں خوف اور شرمندگی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی، بس سسکیاں بھرنے لگی، اس کی خاموشی چیخ چیخ کر سب کچھ بتا رہی تھی کہ اس کی عزت پر حملہ کیا گیا تھا، اسے زبردستی کی کوشش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مشعل کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ یہ سن کر مشعل کا دل بے اختیار غم اور غصے سے بھر گیا۔ یہ ظلم کی انتہا تھی، وہ سمیرا کو دیکھ رہی تھی جس کا جسم اب زخموں کے ساتھ ساتھ ایک روح کی اذیت بھی سہہ رہا تھا۔
سمیرا کی یہ بات سن کر مشعل کا دل بری طرح لرز اٹھا۔ مشعل نے سمیرا کا ہاتھ تھاما۔
"سمیرا، میں تمہارا درد سمجھ سکتی ہوں۔ تم نے جس آزادی کی تلاش میں گھر چھوڑا، وہ تمہیں کہیں اور نہیں ملی، بلکہ ایک نئی قید میں لے آئی۔" مشعل کی آواز میں دھیما پن تھا، مگر الفاظ گہرے تھے۔
"دیکھو سمیرا، وہ بیٹیاں ہی اچھی لگتی ہیں جو اپنے ماں باپ اور ان کی دعاؤں کے سائے تلے رخصت ہوتی ہیں۔ ماں باپ کا گھر قید نہیں ہوتا، وہ تو تحفظ کا قلعہ ہوتا ہے، جہاں کی

پابندیاں دراصل محبت اور فکر کی دیواریں ہوتی ہیں۔ تم نے محبت کا انتخاب کیا، اور تمہارا انتخاب غلط ثابت ہوا۔ ہم سب سے غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن سمیرا، انتخاب کسی کا بھی غلط ہو سکتا ہے، چاہے وہ تمہارا اپنا ہو یا تمہارے والدین کا، یہ صرف قسمت پر انحصار کرتا ہے کہ وہ انتخاب صحیح ثابت ہوتا ہے یا غلط۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ماں باپ کبھی بچوں کا غلط سوچتے ہیں۔ البتہ، اگر اپنا خود کا انتخاب غلط ثابت ہو جائے، تب بھی بہت سے ماں باپ اپنی ناراضگی کے باوجود بیٹیوں کے لیے ایک آخری دروازہ کھولے رکھتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ مجبوری بن جاتی ہے اور بیٹی کا سہارا بننا بھی ناممکن ہو جاتا ہے، اور بیٹی ہر طرف سے بے سہارا ہو جاتی ہے۔ میرا بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ، جب ہم اپنا انتخاب خود کرتے ہیں تو وہ بھی تو غلط ہو سکتا ہے، جیسے تمہارے ساتھ ہوا۔" مشعل نے سمیرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سمیرا، ماں باپ کبھی اپنے بچوں کا برا نہیں چاہتے۔ ان کی سختی ان کی فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔ جو پابندیاں تمہیں اس وقت قید لگ رہی تھیں، وہ دراصل تمہیں دنیا کی کڑواہٹوں سے بچانے کی کوشش تھیں۔ اس کیس کا مقصد صرف تمہیں انصاف دلانا نہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ معاشرے کی ہر سمیرا سمجھے کہ ماں باپ کا گھر قید نہیں ہوتا۔ ان کی دعائیں اور ان کا ساتھ ہی بیٹی کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اس کیس میں ہم نہ صرف تمہیں انصاف دلائیں گے بلکہ یہ بھی ثابت کریں گے کہ بیٹیاں اپنے گھر والوں کے سائے میں ہی محفوظ ہیں۔"

سمیرا نے سسکیاں بھرتے ہوئے مشعل کی طرف دیکھا۔ مشعل کی باتوں میں اسے ایک نئی امید اور زندگی کا ایک ایسا سبق نظر آیا جو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلی بار آنسوؤں کے ساتھ ساتھ ایک چمک سی نظر آئی۔

..☆...☆...☆..

رات کی گہری چادر اوڑھے، شہر خموش تھا، مگر مہتاب صاحب کے اندر ایک طوفان مچا تھا۔ ان کی انگلیاں بے تابانہ فون پر ایک نمبر ملاتیں، مگر ہر بار ایک بے روح خاموشی لوٹ آتی۔ امید اور مایوسی کے جھولے میں جھولتے ہوئے، ان کی پیشانی پر فکر کی گہری لکیریں ابھر آئیں، جیسے کوئی ان کہی کہانی ان کے چہرے پر رقم ہو رہی ہو۔ ہر گزرتا لمحہ ان کے دل میں ایک نیا سوال پیدا کر رہا تھا، ایک ایسا سوال جس کا جواب کہیں دور، کسی اندھیرے کونے میں چھپا تھا۔

:

اسی لمحے، ایک دوسرے جہاں میں، جہاں سناٹا اور تنہائی راج کرتی تھی، یعنی قبرستان میں، بارش کے بے رحم قطرے زمین کو چھو کر ماتم کر رہے تھے۔ ایک بے نام قبر کے سرہانے، ایک لڑکا موجود تھا جس کا چہرہ تاریکی میں پوشیدہ تھا، مگر اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو بارش کے قطروں کے ساتھ مل کر ایک درد بھری داستان رقم کر رہے تھے۔ شراب کی کڑواہٹ اس کے گلے سے اتر رہی تھی، شاید وہ اس کڑواہٹ سے اپنے اندر کے غم کو بھلانا چاہتا تھا۔ قبر پر پڑا فون مسلسل بج رہا تھا، سکرین پر ایک نام روشن تھا، مگر اس روشن نام کو دیکھ کر بھی وہ شخص بے حس تھا، جیسے یہ کال اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

:

اس سب کے ساتھ، ایک تیسری دنیا بھی تھی، ایک بند کمرہ جہاں ہوا بھی سانس لینے سے قائل تھی۔ کمرے میں گہرا اندھیرا چھایا تھا، ہر شے اپنی شناخت کھو چکی تھی۔ اچانک،

دروازہ کھلا اور دو ہاتھ اندر داخل ہوئے، جن میں ایک چمکتا ہوا فون تھا۔ فون کی روشن سکرین نے ایک لمحے کو کمرے کے اندرونی حصے کو ہلکا سا روشن کیا، اور اس مدھم روشنی میں ایک مبہم سایہ نظر آیا جو کمرے کے ایک کونے میں ساکن تھا۔ اس سایے نے آہستہ سے مڑ کر چمکتے فون کی طرف دیکھا۔ ایک نسوانی آواز ابھری:

"آپ کی کال آ رہی ہے۔"

فون ٹیبل پر رکھ دیا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ فون مسلسل بج رہا تھا، اور ہر کال کے ساتھ یہ معمہ مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا کہ آخر یہ پراسرار سایہ کون ہے اور یہ کال کس کی ہے۔

:

تین مختلف دنیاؤں میں پھیلی یہ بے چینی، مہتاب صاحب کی بے قراری، قبرستان میں بجنے والے فون کی گھنٹی کے ساتھ بہتے آنسو، اور تاریک کمرے میں ساکت پراسرار سائے کے ہاتھوں میں بجتی ہوئی فون کی گھنٹی—یہ سب ایک ہی سوال کے گرد گھوم رہے تھے، ایک ایسا سوال جو رات کے اس سناٹے میں کسی ان دیکھی حقیقت کی گہرائیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اور ان کی خاموشی اس راز کو مزید گہرا کر رہی تھی۔ یہ تمام مناظر ایک ان کہے راز کے دھاگے سے جڑے ہوئے تھے، ایک ایسا راز جو ہر لمحہ فون کی گھنٹی کے ساتھ زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔

..☆...☆...☆..

آج بھی شمیم کے چہرے پر وہی مانوس مسکراہٹ تھی جو گرلز ہائی سکول کی ساتویں، آٹھویں جماعت کی طالبات کو زندگی کے مشکل ترین حقائق سے روشناس کراتی تھی۔ وائٹ بورڈ پر اس نے بڑے بڑے حروف میں لکھا، "عزت اور امان کی پہچان!" اور ایک جوشیلے انداز میں پوچھا:

"میری پیاری بچیو! ہماری زندگی میں عزت اور امان کا سب سے بڑا مرکز کون سے رشتے ہوتے ہیں؟"

پوری کلاس کی معصوم آوازوں نے ایک ساتھ گونج کر جواب دیا:

"ہمارے والدین!" شمیم کی آنکھوں میں چمک آگئی، "شاباش! اور خاص طور پر ہم بیٹیوں کے لیے، اللہ تعالیٰ نے کن رشتوں میں تحفظ اور عزت کی امان رکھی ہے؟"

ہوا میں لہراتے بلند ہاتھوں نے فوراً جواب دیا:

"باپ اور بھائی میں!"

شمیم نے بچیوں کو دل کھول کر داد دی اور اپنی بات کو مزید گہرائی دیتے ہوئے کہا، "بالکل صحیح! یاد رکھنا میری بچیو! زندگی میں باپ اور بھائی کے سوا کوئی اور مرد یا لڑکا تمہاری عزتوں کا حقیقی رکھوالا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ نامحرم ہوتا ہے اور تمہاری حفاظت کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی۔ اپنی عزت اور امان کی سب سے بڑی ذمہ داری خود تم پر اور پھر تمہارے خاندان پر ہے، کسی اجنبی پر کبھی بھروسہ مت کرنا۔"

شمیم کا مقصد صرف سماجی اصولوں کی تفہیم کروانا نہیں تھا بلکہ ان ننھے ذہنوں میں تحفظ، عزت اور اپنے رشتے ناتوں کی پہچان کا بیج بونا بھی تھا۔ طالبات ہنستے کھیلتے، مسکراتے ہوئے نہ صرف سیکھ رہی تھیں بلکہ ان کے اندر ایک گہرا علمی اور اخلاقی لگاؤ بھی پیدا ہو رہا تھا۔

چھٹی کی گھنٹی نے سکول میں پھیلی چہل پہل کو ایک دم سے روک دیا۔ شمیم نے پیار بھرے الفاظ سے طالبات کو الوداع کہا اور اپنی کتابیں سمیٹ لیں۔ سکول سے نکل کر وہ

گاؤں کی پکی سڑک پر چل پڑی، جہاں دونوں اطراف لہلہاتے دھان کے کھیت تھے اور ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ وہ پکی سڑک پر قدم بڑھاتے ہوئے، اپنی کتابوں پر نظریں جمائے، شاید دن بھر کی تدریس یا آنے والے کل کے منصوبوں میں گم تھی، جب سورج کی سنہری شعاعیں مغرب کی جانب ڈھلتے ہوئے کھیتوں کو ایک دلکش رنگ دے رہی تھیں۔

اچانک، پیچھے سے ایک پرانی سی جیپ بجلی کی سی تیزی سے نمودار ہوئی۔ شمیم کو اس کی آمد کچھ عجیب سی لگی۔ جیپ نے اس کے قریب آکر رفتار کم کی، اور جیسے ہی وہ بالکل اس کے برابر پہنچی، ایک ہاتھ نے اسے اندر کھینچ لیا۔ یہ سب اس قدر غیر متوقع اور تیز رفتاری سے ہوا کہ شمیم کو سنبھلنے کا ذرا برابر موقع نہ ملا۔ اس کے ہاتھوں سے کتابیں چھوٹ کر سڑک کی دھول میں لت پت ہو گئیں۔ جیپ طوفانی انداز میں آگے بڑھی، پکی سڑک کی دھول فضا میں ایک گھنے بادل کی صورت میں اڑنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے، اس دھول کے غبار میں جیپ اور اس میں شمیم بھی گم ہو گئے۔ پیچھے رہ گئیں تو صرف اس کی گری ہوئی کتابیں، جو خاموشی سے اس ہولناک واقعے کی گواہی دے رہی تھیں۔

..☆...☆...☆..

صحن میں بیٹھی مشعل نے فون کان سے لگایا تو سامنے بکھرے کیس کے کاغذات پر اس کی گہری سوچ کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ قلم اس کے دانتوں میں دبا تھا اور پیشانی پر پڑی شکنیں کسی اندرونی طوفان کی خبر دے رہی تھیں۔ حال ہی میں کی گئی تحقیقات نے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا، مگر اس کے چہرے پر ایک غیر

متزلزل ارادے کی جھلک نمایاں تھی۔ دوسری طرف، آئمہ کی آواز فون کے دوسری جانب گہری تشویش لیے ہوئے تھی۔

"مشعل، میں نے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔"

آئمہ نے نرمی سے کہا، اس کی آواز میں ایک دبی ہوئی التجا تھی۔

"نازیہ میم جو بتا رہی تھیں، کیا تم واقعی وہ کیس لے رہی ہو؟"

مشعل نے کاغذات سے نظر ہٹا کر فون کو مضبوطی سے پکڑا۔ اس کی آواز میں ایک پختہ عزم تھا جو کسی بھی دباؤ سے نہ جھکنے والا تھا۔

"ہاں آئمہ، میں یہ کیس ضرور لڑوں گی۔"

آئمہ کی تشویش اور گہری ہو گئی، گویا وہ اپنی دوست کو کسی سامنے کے خطرے سے آگاہ کرنا چاہ رہی ہو۔

"لیکن مشعل، تم سمجھ رہی ہو یہ کتنا مشکل ہے؟" اس نے آہستگی سے کہا، جیسے لفظوں کو تول کر ادا کر رہی ہو۔

"قانونی پیچیدگیاں دیکھو، اس کیس میں جیتنے کے امکانات آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ مخالف اتنا طاقتور اور بااثر ہے کہ اس کے پاس دولت بھی ہے اور رسوخ بھی۔ ہمارے ادارے کے بڑے بڑے وکیل بھی ایسے معاملات سے کتراتے ہیں۔ اور وہ لڑکی... اس کے پاس تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر تم ہار گئیں تو اس کا کیا بنے گا؟ یہ تمہارے کیریئر کا آغاز ہے، مشعل۔ اس کیس میں ناکامی تمہارے لیے بہت بھاری پڑ سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ تم ابھی پیچھے ہٹ جاؤ۔ کوئی اور تجربہ کار وکیل دیکھ لے گا۔"

مشعل کے چہرے پر تلخی چھا گئی، اس کی آواز میں ایک واضح چیلنج تھا۔

"اگر میں کوشش ہی نہیں کروں گی تو کیسے پتا چلے گا کہ میں ہار جاؤں گی؟"

عزم کی چمک لیے وہ تیزی سے اٹھتے ہوتی بولی،

"اور اس لڑکی کے پاس کوئی نہیں ہے، اسی لیے تو مجھے یہ کیس لڑنا ہے! میں نے جو تحقیقات کی ہیں، اس سے مجھے پتہ چلا ہے کہ اس کا شوہر، کاشف، ایک بہت بڑا گینگسٹر اور ریپسٹ ہے!"

مشعل نے انکشاف کیا، اس کی آواز میں نفرت کی لہر دوڑ گئی۔

؛

اسی اثنا میں، شہر کے دوسرے کونے میں ایک پر تعیش سیاہ جیپ سڑکوں پر ایک پر اسرار سائے کی طرح گشت کر رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا کاشف، سڑک پر ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ گھور رہا تھا، اس کی خبیث آنکھوں کی جھلک جیپ کے سامنے والے شیشے میں صاف دکھائی دے رہی تھی جہاں کوئی بھیانک منصوبہ اس کے ذہن میں پنپ رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے شخص کے چہرے پر غصے کی سرخی نمایاں تھی، پیشانی پر گہرے بل پڑے ہوئے تھے، اور اس کی نیلگوں آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ اس کی خمیدہ ناک ہمیشہ کی طرح اس کے تکبر کی نشاندہی کر رہی تھی، مگر آج اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی جو چہرے پر سختی کی بجائے ایک کمینہ پن لیے ہوئے تھی۔ اس کے بال حسبِ معمول بے ترتیبی سے بکھرے تھے، اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور سینے پر بالوں کا جنگل اس کی مردانگی کی غمازی کر رہا تھا۔ اس کے بڑے اور مضبوط ہاتھ جیپ کی سیٹ پر ایسے جمے ہوئے تھے جیسے کوئی شکار کو دبوچنے والا ہو۔ کلائی پر آج بھی وہ موٹی سونے کی چین نمایاں تھی جو اس کی پہچان بن چکی تھی۔

جیپ کے اندر بیٹھے کئی نوجوان لڑکے بے فکری سے قہقہے لگا رہے تھے، ان کے منہ سے نکلنے والے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے جیپ کے اندر ایک گھٹن زدہ ماحول پیدا کر رہے تھے۔ لیکن اس گھٹن میں کچھ اور بھی تھا جو روح کو لرزا دینے والا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک بند بوری میں کچھ ہل رہا تھا، اور اس میں سے کسی لڑکی کی دبی دبی چیخوں کی آوازیں آ

رہی تھیں، جیسے کسی کا منہ سختی سے بند کر دیا گیا ہو یا اسے رسیوں سے جکڑ دیا گیا ہو۔
کاشف اور اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے ایک دوسرے سے کمینگی بھری ہنسی کے ساتھ ہاتھ ملائے، گویا کوئی گھناؤنا راز انہوں نے آپس میں بانٹا ہو۔ کاشف کے چہرے پر اطمینان اور طاقت کا غرور نمایاں تھا، جبکہ اس کے ساتھ بیٹھے شخص کی نظروں میں ایک گہری چالاکی اور خفیہ منصوبہ بندی چھپی ہوئی تھی۔
یہ وہ خوفناک حقیقت تھی جو مشعل کے علم میں نہیں تھی، مگر یہی وہ تاریک سچائی تھی جس کے خلاف مشعل لڑنے کا ارادہ رکھتی تھی، چاہے اس کی قیمت کچھ بھی ہو۔

:

"یہ صرف ایک کیس نہیں، آئمہ، یہ انصاف کی جنگ ہے۔ اگر ہم سب ڈر کر پیچھے ہٹ جائیں تو ان ظالموں کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے!"
مشعل کی آواز بلند ہونے لگی،
"کیا میں اتنی کمزور ہوں؟ کیا میں اس قابل نہیں کہ ایک مظلوم کو انصاف دلا سکوں؟ تم بھی تو وکیل ہو، آئمہ۔ تمہیں تو سمجھنا چاہیے کہ انصاف کتنا ضروری ہے۔"
اسی دوران، مہتاب صاحب کے کمرے کے باہر ایک بھاری بھرکم اور بارعب شخصیت خاموشی سے کھڑا تھا۔ وہ سلمان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت اور مضبوطی کا عکس تھا، اور اس کا انداز کسی بھی صورتحال پر گہری نظر رکھنے والے شخص کا سا تھا۔ مشعل اور آئمہ کی گفتگو کی ہر بات اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی، اور اس کے چہرے پر کسی گہرے تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا، مگر اس کی گہری نظریں کہیں دور خلا میں گھور رہی تھیں۔
آئمہ نے گہری سانس لی۔

"میں سمجھتی ہوں، مشعل۔ لیکن حقیقت پسندی بھی ضروری ہے۔ ہر جنگ جیتنے کے لیے نہیں لڑی جاتی۔" اس کی آواز میں ایک دبا ہوا درد تھا، جیسے وہ اپنی دوست کو کسی اندھی گلی میں جانے سے روک رہی ہو۔

بحث شدت اختیار کر گئی، مشعل کی آواز اب تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ آئمہ کی ہر نصیحت اسے اپنی کمزوری اور ناتجربہ کاری کا طعنہ لگ رہی تھی۔ بالآخر، مشعل نے غصے سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے فون کو اپنے کان سے ہٹایا، "بس کرو آئمہ! تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کال کاٹ دی۔

سلمان نے ایک لمبی سانس لی اور ایک فیصلہ کن نظر دروازے کی طرف ڈالی، جہاں سے مشعل کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں کچھ منصوبے بن رہے تھے۔

..☆...☆...☆..

فون بند کرتے ہی مشعل نے سمیرا کیس کی فائلیں یوں سمیٹیں جیسے ہر ورق میں اس کی بے تاب روح قید ہو۔ اس کا وجود بے اختیاری میں باہر کی جانب لپکا، ہر قدم میں عدالت تک پہنچنے کی جنونی خواہش اور ایک انوکھا، سلگتا جوش عیاں تھا۔ قدم خود بخود تیز ہوتے چلے گئے، لیکن یکایک وہ تھم سی گئی — جیسے کوئی قیمتی اثاثہ اندر ہی رہ گیا ہو۔

"مشعل!"

سلمان کی دھیمی مگر پر تاثیر آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس کی نظر میز پر پڑی مشعل کی بھولی ہوئی فائل پر تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے وہ فائل اٹھائی اور مشعل کے پیچھے دوڑا۔

مشعل مڑی تو سلمان کو ہاتھ میں اپنی فائل لیے دیکھ کر اس کی پیشانی پر ناگواری کے بل پڑ گئے۔ وہ جو پہلے ہی غصے کی چنگاریوں میں لپٹی ہوئی تھی، آج تمام تر عزت و احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تلخی سے بولی:

"سلمان بھائی! آپ کو میرا گارڈین اینجل بننے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ کی شدت کسی چیخ سے کم نہ تھی۔

سلمان نے ایک لمحے کے لیے اسے حیرانی سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، جیسے اس نے مشعل کی اندرونی جلن اور طوفانی غصے کو بھانپ لیا ہو۔

"لیکن لٹل، تم اپنی فائل..."

"ہاں تو میں لینے جا ہی رہی تھی نا!"

مشعل نے اسے تیزی سے ٹوکا، اس کی آواز کی حدت مزید بڑھ گئی۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی میرا کام کرنے کی؟ آپ سب کو کیا لگتا ہے میں اپنا کام خود نہیں سنبھال سکتی؟ کیا میں اتنی نااہل ہوں؟"

اس کے تیور غصے سے چڑھے ہوئے تھے، جیسے کوئی بے قابو طوفان اندر ہی اندر کروٹیں لے رہا ہو۔

سلمان کے چہرے پر مشعل کی تلخی اور لہجے کی شدت سے ناگواری کی پرچھائیاں پھیلنے لگیں۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور آنکھوں میں ہلکا سا غصہ جھلکنے لگا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا، اس کے لہجے میں اب سنجیدگی اور ایک پراسرار سی وارننگ اتر آئی تھی۔

"مشعل، میں نے تمہیں فون پر آئمہ سے ہوئی گفتگو سنی۔ یہ کیس جتنا تم سمجھ رہی ہو، اس سے کہیں زیادہ پر خطر اور پیچیدہ ہے۔ تمہیں محض سہاروں کی نہیں، بلکہ مضبوط ترین بنیادوں کی ضرورت پڑے گی کیونکہ اس کا باپ..."

سلمان کی بات ابھی ادھوری تھی کہ مشعل نے اسے جھٹکے سے ٹوک دیا۔

"بس کریں! مجھے کسی کی ضرورت نہیں!"

مشعل نے اس کی بات کاٹی، اس کا چہرہ غصے سے کندن کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

"میں کسی کے باپ سے نہیں ڈرتی، سمجھے آپ؟ اور نہ ہی مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت ہے۔"

غصے میں اس کی آواز بے قابو ہو چکی تھی، اور اسے ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔

سلمان کا صبر اس کی بلند آواز اور مسلسل بد تمیزی سے جواب دے گیا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی اور اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، اس کی آنکھوں میں شدید ترین تاثرات تھے۔

"کسی کے باپ سے نہیں ڈرتیں، لیکن اپنے باپ سے تو ڈرتی ہو نا؟"

اس کی آواز میں ایک ایسی کڑک اور تلخی تھی جو مشعل کے غصے کی ساری آگ کو پل بھر میں ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی تھی۔

"تمہارے اسی باپ کے حکم پر میں تمہیں یہ 'پک اینڈ ڈراپ' کی خصوصی سہولت دینے آیا ہوں! اب چلو میرے ساتھ! ایک لفظ مزید نہیں!"

مشعل ایک لمحے کے لیے ساکت و بے حس کھڑی رہ گئی، اس کی آنکھوں میں نمی کا ایک شفاف پردہ چمکنے لگا۔ سلمان کے تلخ لہجے نے اسے اپنی بد تمیزی کا گہرا احساس دلایا تھا، اور اس احساس کے ساتھ ہی ایک تلخ حقیقت نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا: اسے سلمان

کے ساتھ ہی جانا پڑے گا۔ ایک گہرا سانس لے کر وہ بے بسی کی تصویر بنی سلمان کے پیچھے گاڑی کی طرف بڑھی، اس کے قدموں میں ندامت کا ان دیکھا بوجھ تھا۔

گاڑی تیزی سے عدالت کے دروازے پر رکی۔ مشعل نے سرعت سے خود کو گاڑی سے باہر نکالا، مگر سلمان نے پلک جھپکتے ہی گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ مشعل کو ایک لمحے کا بھی موقع نہ ملا کہ وہ سلمان سے اپنی بدتمیزی کی معذرت کے چند الفاظ بھی کہہ پاتی۔ وہ بے سدھ سی کھڑی، پرسوچ نگاہوں سے اوجھل ہوتی گاڑی کو دیکھتی رہی۔

گاڑی چند ہی سیکنڈوں میں نظروں سے غائب ہو چکی تھی، اور اپنے پیچھے مشعل کی پشیمانی چھوڑ گئی۔

مشعل نے بے چینی سے اپنے ہاتھوں میں تھامی فائلیں اور کندھے پر لٹکے بیگ کو دیکھا، ایک کڑوا خیال زہر کی طرح اس کے حلق سے نیچے اترا۔

"اوشیٹ، میری فائل..."

ایک بار پھر وہ اپنی اہم فائل بھول آئی تھی۔ پہلی دفعہ وہ فائل گھر میں بھول گئی تھی، لیکن اس بار جب وہ سلمان کی گاڑی سے اتری، تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنی فائل سلمان کی گاڑی میں ہی بھول گئی ہے۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر، اس نے فوراً ایک آٹو روکا اور سلمان کے دفتر کی جانب بھاگی، اس کے دل میں بے پناہ پریشانی کا طوفان برپا تھا، ندامت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ آج پہلی بار اس نے سلمان سے اس طرح بحث کی تھی، اسے خود پر شدید غصہ اور رونا آ رہا تھا کہ آخر اس نے ایسا احمقانہ کام کیا کیوں؟

آٹو جیسے ہی دفتر کے باہر رکا، مشعل بجلی کی سی تیزی سے سلمان کی گاڑی کی طرف لپکی۔ اس نے شیشے کے پار گاڑی کے ڈیش بورڈ پر اپنی فائل دیکھی اور بے ساختہ دروازہ کھولنے کی کوشش کی، مگر گاڑی لاک تھی۔ اب وہ تیزی سے دفتر کے اندر داخل ہوئی، لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی وہ سیدھا سلمان کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ

دروازہ کھول کر اس کے کیبن میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ اچانک کچھ سوچ کر رک گئی اور دروازہ کھٹکھٹا کر اندر سے اجازت کی منتظر رہی۔ اس کے اندر ایک عجیب کشمکش جاری تھی۔

کچھ توقف کے بعد مشعل نے بے چینی سے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا، اس کے اندر کا اضطراب اب بیزاری و ناگواری کی واضح شکل اختیار کر چکا تھا۔ اندر سے مسلسل دستک کی کوفت سہتے ہوئے، سلمان غضب ناک، سرخ انگارہ آنکھوں کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھا۔ جیسے ہی دروازہ کھولا، مشعل کا ہاتھ بے ساختہ سلمان کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ اس لمس کے ساتھ ہی جیسے کائنات کی گردش تھم سی گئی، وقت ٹھہر گیا، اور دونوں کے سینوں میں ہزاروں رنگین تتلیاں اپنے پر پھیلانے لگیں، دل گویا پسلیوں کے پنجرے توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو اٹھے۔ اس لمحے، تمام تر غصہ، ساری کڑواہٹ جیسے پگھل کر عدم ہو گئی۔ ایک پل کو سلمان کی سرخ آنکھوں میں نظریں اٹھاتے ہی، مشعل کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی، وہ تھرتھرا اٹھی، یکلخت اس کے دل میں ایک انوکھا، غیر محسوس خوف سرایت کر گیا۔

"کیا ہوا؟" سلمان نے فوراً پوچھا، اس کی آواز میں حیرت، تشویش اور بے پناہ فکر مندی نمایاں تھی۔ "یوں کانپ کیوں رہی ہو لٹل؟ کیا ہوا۔"

معصومیت نم پلکوں پر سجائے، نظریں اٹھا کر مشعل نے ہکلاتے ہوئے کہا:

"آپ کے غصے سے ڈر لگ رہا ہے۔"

اس کی آواز میں شرمندگی اور خوف کا ایک عجب، دل نشین امتزاج تھا۔

سلمان نے مشعل کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس کی معصومیت پر سلمان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور اس نے اپنا سر جھکا کر، مشعل کی نظروں میں دیکھتے ہوئے دھیمی، گہری آواز میں اعتراف کیا:

"ڈر تو میں بھی گیا ہوں، لٹل۔" اس کے لہجے میں ایک انوکھی صداقت تھی۔

مشعل نے حیرانی کے عالم میں سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیوں؟ آپ کیوں ڈر گئے؟" اس نے بمشکل پوچھا۔

"میں ڈر گیا تھا کہ کسی کا تھاما ہوا یہ ہاتھ اگر چھوٹ گیا تو میں پھر ان اندھیروں میں کہیں واپس نہ چلا جاؤں۔"

سلمان نے کہا، اس کی نظریں مشعل کی آنکھوں میں گڑی تھیں، جیسے وہ اس کی روح کے اندر جھانک رہا ہو، اس کے وجود کی گہرائیوں کو محسوس کر رہا ہو۔ مشعل ہی وہ لڑکی تھی جو سلمان کو اس کے تاریک ماضی کے دلدل سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہی تھی، اور آج سلمان نے نہ صرف مشعل کے تلخ لہجے کی کاٹ محسوس کی بلکہ اس کے لہجے میں چھپی عجیب سی بے حسی، بے اعتنائی اور بے نیازی نے بھی اس کے دل میں مشعل کے کھو جانے کا گہرا ڈر پیدا کیا تھا۔

یہ مکالمہ ابھی جاری تھا کہ ایک مدھر، پر وقار آواز کے ساتھ ہی مشعل کا ہاتھ سلمان کے ہاتھ سے ایسے چھٹا جیسے کسی کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں پیچھے مڑی تو اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دلکش، حسین اور پر اسرار نسوانی حسن کا سرچشمہ لڑکی کھڑی تھی—ایہا بہلول۔

"ہیلو، سلمان۔"

ایہا نے ایک لمحے کے لیے مشعل پر سرسری، جانچتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر مسکرا کر سلمان کی طرف دیکھا۔ فضا میں ایک عجیب سی، ناگفتہ بہ کشمکش نے جنم لیا۔ جب وہ ایک پر ادا، ریشمی انداز سے ہاتھ لہراتے ہوئے 'ہیلو' کہہ کر ان کی جانب آگے بڑھی، تو ان تینوں کے درمیان ایک نئی، ان کہی اور غیر متوقع داستان کا آغاز ہو چکا تھا۔

..☆...☆...☆..

..☆...☆...☆..

وہ لمحہ آن پہنچا تھا جب شہر کی کشش سلمان کو اپنی جانب کھینچ رہی تھی، مگر اس کے دل کا ایک ٹکڑا دادی کے پاس رہ جانے پر بضد تھا۔ کمرے میں پھیلی سامان کی بو اور آخری شرٹس کی تہہ بندی، سب کچھ اس الوداعی گھڑی کا اشارہ دے رہا تھا۔ دل پر ایک انجانا سا بوجھ تھا، دادی سے جدائی کا خیال ہی اسے بے چین کر دیتا تھا۔ انہی گہری سوچوں میں گم

تھا کہ دروازے پر دادی کی وہ کھنکتی ہوئی آواز گونجی، جو عمر کی قید سے آزاد، ہمیشہ کی طرح شوخ اور چنچل تھی۔

"اوئے میرے ہینڈسم! اکیلا ہی سارا بوجھ اٹھائے گا؟ اپنی بوڑھی دادی کو بھول گیا؟"

دادی، اپنی مخصوص شان سے، ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں میں سوجی کی مٹھائی سے بھری پیالی تھی جس کی دلنشین خوشبو پورے کمرے میں پھیل گئی۔

آج وہ کچھ زیادہ ہی نکھری نکھری، سجی سنوری لگ رہی تھیں، جیسے ان کے ہر انداز میں سلمان کو خوش کرنے کی چاہت چھپی تھی۔

سلمان پلٹا، اس کے ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔

"میری گرل فرینڈ! آج تو کمال لگ رہی ہو، کسی فلمی ہیروئن سے کم نہیں۔ کیا ارادہ ہے؟ آج بھی کسی کو کلین بولڈ کرنا ہے؟"

اس نے شرارت سے دادی کی طرف دیکھا، جیسے کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے ناز کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور شرارت کی ایک انوکھی چمک تھی۔

دادی نے ایک مصنوعی غصے سے اس کے کندھے پر تھپکی دی، جس میں پیار کی شیرینی گھلی تھی۔ "دفع ہو جا! تیرا دادا ابا بھی ایسے ہی چھیڑتا تھا اور اب تو بھی شروع ہو گیا ہے۔ ویسے تو سچ کہہ رہا ہے، میری جوانی میں تو بڑے بڑے جوان کلین بولڈ ہوتے تھے۔"

انہوں نے فخر سے اپنی چمکتی آنکھوں سے سلمان کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں ماضی کی حسین یادیں رقص کر رہی تھیں۔

"پر تجھ سا عاشق آج تک نہیں دیکھا میں نے۔"

ان کا لہجہ ممتا بھری فخر سے لبریز تھا۔

سلمان ہنس پڑا۔

"آپ بھی نہ دادی! میری تو قسمت ہی خراب ہے کہ آپ نے خود کو ہی میری گرل فرینڈ بنا کر رکھا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مجھے کسی اور کی طرف دیکھنے ہی نہیں دیا۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا، اس کے لہجے میں محبت بھری شکایت تھی، جیسے وہ اپنی محبوبہ سے دل کے راز کہہ رہا ہو۔

دادی کا ہنستا چہرہ ایک لمحے کو سنجیدہ ہوا، جیسے کوئی گہری بات یاد آئی ہو، پھر ان کے ہونٹوں پر دوبارہ وہی دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے مٹھائی کی پیالی سلمان کو پکڑی اور اس کے کندھے پر پیار سے تھپکی دی۔

"اوئے پاگل! یہ کیا باتیں کر رہا ہے؟"

ان کی آواز میں شوخی کی ایک نئی لہر تھی۔

"تیرے جیسا ہینڈسم اور ذہین لڑکا بھلا اکیلا کیسے رہ سکتا ہے؟ تو بس دیکھتا جا، جب تیرے لیے میں کوئی ہیروئن تلاش کروں گی نا، تو تو ساری فلمیں بھول جائے گا۔" دادی نے آنکھ ماری۔

سلمان نے مصنوعی ناراضگی سے کہا،

"پر آپ کے نخرے؟ آپ کو آپ کی بہو یا کوئی اور برداشت بھی تو نہیں کر سکتا۔"

دادی نے ایک دلکش قہقہہ لگایا، جس سے کمرہ گونج اٹھا۔

"ہاں نخرے تو ہیں میری جان! اور وہ اس لیے ہیں کہ تجھے چھیڑ سکوں۔ بھلا تجھے چھیڑنے کا موقع کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟"

انہوں نے سلمان کا ہاتھ تھاما، ان کی آنکھوں میں ایک حسین خواب چمک رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے پتر، جب تو شہر سے واپس آئے گا تو یہ گھر پھر سے ہنسنے لگے گا۔ پر ایک بات یاد رکھ، تیری دادی کے نخرے کچھ وکھرے ہیں۔ ان کو برداشت کرنے والا بھی کوئی وکھرا ہی ہو گا نا!"

انہوں نے سلمان کے گال پر پیار سے ایک چٹکی بھری۔

سلمان نے دادی کا ہاتھ تھام کر اپنے دل سے لگا لیا۔ "دادی، آپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ آپ کے نخرے اٹھانے والا آپ کا یہ پوتا ابھی زندہ ہے۔"

اس نے پیار سے دادی کے جھریوں بھرے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور رضا گیلانی کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ سلمان کے والد تھے، اور ان کے چہرے پر بھی وہی دادی والی چمک اور رکھ رکھاؤ تھا، بس عمر کے ساتھ کچھ سنجیدگی بھی در آئی تھی۔

"لگتا ہے میرے بیٹے کا بوریا بستر بندھ گیا ہے، اور ماں جی کی جذباتی گفتگو ابھی جاری ہے۔"

رضا نے ہنستے ہوئے کہا، ان کی آواز میں محبت اور چھیڑ چھاڑ کا وہی انداز تھا جو دادی اور سلمان میں جھلکتا تھا۔

سلمان نے والہانہ انداز میں والد کو گلے لگایا۔

"ابو! آپ کو پتا ہے میری گرل فرینڈ! یہ تو مجھے جانے ہی نہیں دیتیں۔"

رضا نے دادی کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔ "ماں جی، آپ کا یہ لڑکا اب شہر اپنے کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہے، اس کو روکو نہیں، اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کرو۔"

دادی نے پیار سے سلمان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں، شاید جدائی کا احساس اب انہیں بھی چھو چکا تھا۔

"جا پتر، رب راکھا۔ اور ہاں! میری بہادری یاد رکھی۔ تیرے میں جو دلیری ہے، وہ میری دین ہے۔"

ان کے الفاظ میں ایک مٹھاس تھی، جیسے وہ اپنی تمام محبت اور اپنا سارا تجربہ سلمان کے لیے نچوڑ رہی ہوں۔

سلمان گاڑی میں بیٹھا اور دادی کو دیکھا۔ رضا گیلانی، جو اسے چنار کھیڑا سے شہر چھوڑنے جا رہے تھے، ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوئے۔ گاڑی اب روانہ ہونے کو تھی اور دادی برآمدے میں کھڑی، مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر ان کے چہرے پر ہنسی اور اداسی کا وہ ہی انوکھا امتزاج تھا—ایک ایسا امتزاج جو صرف دادی اور پوتے کے رشتے میں ہی مل سکتا ہے۔ سلمان نے ہاتھ ہلایا، اور ان کا ہنستا، روتا چہرہ پیچھے چھوڑتا ہوا چنار کھیڑا سے شہر کی طرف چل پڑا، اپنے پیچھے ایک انمول رشتہ، محبت اور چھیڑ چھاڑ کا حسین بندھن چھوڑ گیا۔ یہ محض ایک جدائی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسے رشتے کی گواہی تھی جو وقت اور فاصلے سے ماورا تھا۔

گاڑی جیسے ہی تھوڑی آگے بڑھی، دادی نے یاد دلانے والے انداز میں آواز دی،

"اور ہاں، رضا! ذرا مشعل کو بتا دینا کہ دادی اسے یاد کر رہی تھی، اور یہ بھی کہ اس کی وکالت کا یہ پہلا سال کیسا جا رہا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے ہاتھ ہلایا اور ان کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سلمان کا دل ایک بار پھر دادی کی محبت سے سرشار ہو گیا، اور ان کی گاڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

..☆...☆...☆..

گاؤں کے چوپال میں ملک زبیر اپنی گاڑی کے بونٹ پر اکڑ کر بیٹھا تھا، اس کے ارد گرد اس کے دوستوں کا ہجوم تھا۔ ان کی ہنسی کی آوازیں دور دور تک پھیل رہی تھیں جو بانو کی سسکیوں پر بھاری پڑ رہی تھیں۔ بانو، ایک کم عمر لڑکی، سر جھکائے، خوفزدہ کھڑی تھی اور اس کے ہونٹوں سے بمشکل سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ تنہا تھی اور ملک زبیر کے گھر میں کام کرتی تھی، جس کا مطلب تھا کہ اس کی زندگی ملک زبیر کے رحم و کرم پر تھی۔ ملک زبیر کے ہاتھوں میں ایک لکڑی تھی جسے وہ اچھال اچھال کر بانو کو مزید ڈرا رہا تھا۔ اس کے دوست بھی قہقہے لگا رہے تھے اور بانو کی بے بسی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے چھو کر، آوازیں کس کر مزید ہراساں کر رہے تھے۔ بانو کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ مدد کے لیے چاروں طرف دیکھ رہی تھی لیکن کوئی اس کی مدد کو آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ شمیم، جو تھوڑی دور کھڑی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی، اس کا خون کھول اٹھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ بانو جیسی معصوم لڑکی کو یوں سرعام ذلیل کیا جائے۔ بانو کی سسکیاں اور اس کی خوفزدہ نظریں شمیم کے دل میں پیوست ہو رہی تھیں۔ شمیم کی مٹھی بھینچ گئی اور اس کے چہرے پر ایک عزم نمایاں ہوا۔ وہ جانتی تھی کہ ملک زبیر گاؤں کا امیر اور بااثر زمیندار ہے، جس کے سامنے کوئی آواز اٹھانے کی جرات نہیں کرتا، لیکن اس وقت اسے اپنی پرواہ نہیں تھی۔

وہ ایک لمحے کے لیے بھی رکی نہیں اور بانو کی طرف بڑھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر اس کے قدم مضبوط اور ارادے اٹل تھے۔ اس نے ملک زبیر کے قریب پہنچ کر ایک گہری سانس لی اور پوری طاقت سے آواز بلند کی۔

"تم لوگ درندے ہو! حیوان!" شمیم کی آواز فضا میں گونجی۔

"تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی؟ ایک بے گناہ لڑکی کو یوں رسوا کرتے ہوئے؟"

ملک زبیر، جو اپنی بدمعاشی میں مگن تھا، شمیم کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ ایک شیطانی چمک بھی نمودار ہوئی۔ اس کے دوست بھی اپنی ہنسی روک کر شمیم کو گھورنے لگے۔ ملک زبیر، جو گاؤں کا جانامانا امیر اور زمیندار تھا، کسی کی جرات پر حیران تھا کہ کوئی اس کے سامنے آواز بلند کرے۔ بانو اور شمیم جیسی گاؤں کی غریب لڑکیاں اس کے لیے محض ایک کیڑے کی حیثیت رکھتی تھیں جنہیں وہ جب چاہتا روند سکتا تھا۔

"اوہو! یہ کون سی نئی حسینہ ہے جو اتنی تیزی دکھا رہی ہے؟"

ملک زبیر نے ایک خبیث مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لگتا ہے تمہیں بھی بانو کی طرح سبق سکھانے کی ضرورت ہے!"

شمیم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، اس کی نظروں میں نہ کوئی خوف تھا اور نہ ہی کوئی جھجک۔

"میں بانو نہیں ہوں، جو تمہارے سامنے سر جھکا دوں گی۔ میں شمیم ہوں اور میں تمہاری بدمعاشی کو بے نقاب کروں گی!"

اس کی آواز میں گاؤں کی ان تمام مظلوم لڑکیوں کی گونج تھی جنہیں ملک زبیر جیسے ظالموں نے ہمیشہ حقیر سمجھا تھا۔

اس کے الفاظ ملک زبیر اور اس کے حواریوں کے لیے کسی چیلنج سے کم نہ تھے۔ ان کی آنکھوں میں غصہ اور نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی، پھر ملک زبیر کے ایک دوست نے ایک کرخت لہجے میں کہا،

"اس لڑکی کی ہمت تو دیکھو! اسے تو مزہ چکھانا پڑے گا!"

شمیم نے ایک سرد نگاہ ان سب پر ڈالی اور غرور سے سر اٹھا کر بولی،

"تم لوگوں کی اوقات ہی کیا ہے؟ تم صرف بزدل اور نامرد ہو۔"

یہ کہتے ہوئے شمیم نے بانو کا ہاتھ پکڑا جو ابھی تک لرز رہی تھی اور اسے اپنے ساتھ کھینچنے لگی۔ ملک زبیر کے دوستوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی، ان پر پھبتیاں کسیں، مگر ملک زبیر نے ایک سرد اشارے سے انہیں روک دیا اور شمیم اور بانو کو وہاں سے جانے دیا۔ اس کی نظروں میں ایک خاموش عہد تھا:

شمیم کو اس کی جرات کی قیمت چکانی پڑے گی۔ شمیم جانتی تھی کہ اس کی یہ بے باکی اب اسے ایک نئے طوفان کی زد میں لے آئے گی۔ ملک زبیر اور اس کے حواریوں کی تمام توجہ اب بانو سے ہٹ کر پوری طرح شمیم پر مرکوز ہو چکی تھی۔

..☆...☆...☆..

ایک سرد، بے رنگ شام تھی جس کا سناٹا چار سو پھیلا ہوا تھا۔ مشعل کے دفتر سے ہزاروں میل دور، شفق کے گھر میں بھی اسی طرح کی گھٹن محسوس کی جا سکتی تھی۔ صحن میں، پھیکی روشنی کے جھروکے میں، سمیرا گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے یوں بیٹھی تھی جیسے اس کا اپنا وجود ہی اس کے بے کراں غم کا بوجھ بن چکا ہو۔ آنکھیں نم تھیں مگر سسکیاں اس نے حلق میں ہی گھونٹ رکھی تھیں۔ ماضی کی سرگوشیاں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں، جہاں اس کی زندگی کا ایک کڑوا سچ کسی ناسور کی طرح چھپا تھا۔

سمیرا کے ذہن میں لہریں بناتا وہ خیال، جو اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر رہا تھا:

"امی، آپ تو جانتی ہیں میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں!" اس کی آواز میں ایک التجا تھی جو دل چیر رہی تھی۔

"تمہاری پسند تمہارے باپ کی عزت سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔"

ماں کا دوٹوک، پتھر جیسا لہجہ سمیرا کے دل پر ہتھوڑے کی طرح گرا۔ ایک لمحے کو جیسے اس کی دھڑکن تھم سی گئی، وہ خاموش ہو گئی۔

پھر، تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد، ایک ٹھنڈی خبر اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتری۔ "تمہارے باپ نے اس مہینے کی آٹھ تاریخ کو تمہاری رخصتی طے کر دی ہے۔"

"امی! انکار کا اختیار ابھی بھی ہے میرے پاس،" سمیرا کی آواز میں امید کی ایک مدھم سی لہر لرزش کر رہی تھی۔

"اگر ایسا ہو گیا تو کیا عزت رہ جائے گی ابو کی؟"

ماں نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو نگلتے ہوئے کہا،

"سمیرا! آج تک گھر کا ہر فیصلہ تمہارے ابو نے ہی کیا ہے۔"

"عورت کو بولنے کا اختیار کبھی دیا ہی کب ہے اس گھر میں؟" سمیرا نے بے بسی سے جیسے خود کلامی کی۔

اس کی ماں اب خاموش تھی، اس کی نظریں خلا میں جمی تھیں، جیسے وہ اپنی بیٹی کی بے بسی کو محسوس کر رہی ہو۔

"امی! جس دور میں، میں رہتی ہوں نا، اس دور کی لڑکیاں جینز اور ٹی شرٹ پہن کر آزادی سے گھومتی ہیں۔ اور میں؟" سمیرا کی آواز میں درد بڑھتا گیا۔

"میں اس گھٹن زدہ ماحول میں سانس لے رہی ہوں جہاں زبان، آنکھ، کان سب بند کر کے رہنا پڑتا ہے۔ اجازت ہے تو صرف سانس لینے کی۔ آج یہ خبر سنا کر تو آپ نے سانس لینے کا بھی حق چھین لیا ہے مجھ سے۔"

اس کی ماں اب بھی خاموش تھی، سرد نگاہیں دور کسی نقطے پر مرکوز کیے وہ یوں سن رہی تھیں، جیسے وہ خود بھی اسی قید کی زنجیروں میں جکڑی ہو۔

"امی! اسلام نے مرد کو جائیداد کا حقدار بنایا ہے، لیکن وہ عورت کے حقوق پر زمینی خدا بن کر بیٹھ گیا ہے۔ کیا اسلام نے عورت کو اپنی پسند کا اختیار نہیں دیا؟"

"کس کی شہہ پر تم اپنے باپ کے خلاف اتنا بڑھ چڑھ کر بولنے لگ گئی ہو سمیرا؟" سمیرا کی امی نے پہلی دفعہ سوال کیا، ان کی آواز میں ناگواری کے ساتھ تاسف بھی تھا۔

"اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی امی، آپ کو لگتا ہے کہ میں کسی کی شہہ پر بول رہی ہوں۔ اس سے تو اچھا تھا پیدا ہوتے ہی مجھے دفنا دیتے آپ لوگ،" سمیرا نے اپنے درد کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔

اچانک ایک نرم ہاتھ نے سمیرا کے کندھے کو چھو کر اس کی غمی کا طلسم توڑ دیا۔ سمیرا نے چونک کر سر اٹھایا تو سامنے شفق کھڑی تھی، اس کی آنکھوں میں ہمدردی اور گہری فکر جھلک رہی تھی، شفق نے سمیرا کی آنکھوں کی نمی دیکھی تو اسے سمجھ آ گیا کہ سمیرا ابھی بھی اپنے ماضی کے دکھوں میں گھری ہوئی ہے۔

سمیرا نے سسکیاں بھرتے ہوئے شفق کو گلے لگایا اور بے اختیار رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں اس کی روح کی چیخیں تھیں۔

"شفق آپی، ایک جوان اولاد کو ماں باپ بیس پچیس سال پالتے پوستے ہیں، اس کے لیے نہ جانے کتنی قربانیاں دیتے ہیں، اپنے خوابوں کو تیاگ دیتے ہیں تاکہ ان کی اولاد ایک خوشگوار زندگی گزار سکے۔ مگر اکثر یہی ہوتا ہے کہ لڑکیاں محض ایک دو سال یا چند

مہینوں کی محبت کے سامنے ان بیس پچیس سال کی محبت اور قربانی کو فراموش کر دیتی ہیں۔ اپنی پسند میں بھاگ کر اپنی مرضی کر لیتی ہیں اور یہ نہیں سوچتیں کہ ان کے اس ایک فیصلے سے والدین کا کیا بنے گا، ان کی عزت اور وقار کیسے پامال ہو گا؟" سمیرا کی آواز میں گہرا پچھتاوا تھا۔

جونہی اس کی بات کا تار ٹوٹا، سمیرا شفق کے آغوش میں سمٹ گئی اور اس کی ہچکیوں نے جیسے روح کی چیخوں کا روپ دھار لیا۔ ہر سسکی فضا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی، ٹھیک اسی طرح جیسے صحن کے کنارے سلگتے سگریٹ کا دھواں ہوا میں گھل رہا تھا۔ اس کی نم آنکھیں بے ساختہ صحن میں ساکت کھڑے ایک مبہم سائے پر جا ٹکیں۔ چہرہ واضح نہ تھا، مگر زبان سے بے اختیار "احمر بھائی!" پھسل پڑا۔ شفق کے سہارے سے ہٹ کر وہ لرزتی ہوئی پیچھے سرک گئی۔

احمر، جو شفق کا شریک حیات تھا، سمیرا کو اشکوں سے تر دیکھ رہا تھا۔ سمیرا کی سسکیوں کی بازگشت اس کے سماعتوں میں یوں گونج رہی تھی، جیسے اس کے اپنے دل کے نہاں خانوں میں بھی کسی اَن کہے دکھ کی چاپ سنائی دے رہی ہو۔

:

مشعل کے دفتر میں کھڑکی سے چھن کر آتی پھیکی روشنی نے میز پر بکھرے کاغذات کو مزید بے جان بنا دیا تھا۔ یہ اس کے وکالت کے کیریئر کا آغاز تھا، اور ہر نیا موڑ ایک تازہ آزمائش بن کر سامنے کھڑا تھا۔ آج بھی ایک ایسا ہی کیس اس کے سامنے پڑا تھا—ایک ہاری ہوئی جنگ، مگر مشعل کے لیے گہرے زخم کی سی کسک۔ اس کے سامنے بیٹھی سینئر وکیل نازیہ رحمن کی آواز میں تھکن اور برسوں کے تجربے کی گہرائی گھلی ہوئی تھی، جو ان کی آنکھوں میں جھلکنے والے لاتعداد کیسز کی داستان سنا رہی تھی۔

"مشعل، میں جانتی ہوں یہ کیس کتنا مشکل ہے،" نازیہ رحمن نے نرمی مگر پختگی سے سمجھایا۔

"وہ لڑکی گھر سے بھاگ کر شادی کر چکی ہے۔ معاشرہ اسے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ عموماً گھریلو جھگڑے اور مار پیٹ کے کیسز تو کسی نہ کسی طرح سلجھ جاتے ہیں، مگر یہ معاملہ بالکل مختلف ہے۔ قانونی طور پر اس کی گتھی سلجھانا انتہائی پیچیدہ ہے۔ لڑکی کے پاس نہ کوئی مضبوط پشت پناہ ہے اور نہ ہی مالی وسائل۔ اس کے برعکس، شوہر کے پاس اثر و رسوخ بھی ہے اور بینک بیلنس بھی۔ ثبوت نہ ہونے کے برابر ہیں، یہ کیس کسی بھی وکیل کے لیے ایک بڑی قانونی رکاوٹ ہے۔ کوئی بھی یہ کیس لینے کو تیار نہیں، تم بھی نہ لو تو بہتر ہے۔"

مشعل کی نظریں میز پر پڑے کیس پیپرز پر مرکوز تھیں، جہاں ساس اور شوہر کے ظلم و ستم کی ہوش ربا کہانیاں درج تھیں۔ جسمانی اور جذباتی تشدد کی وہ تفصیلات جنہیں پڑھتے ہوئے بھی روح کانپ اٹھتی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ ان تمام کاغذات کو پھاڑ دے، اور اس ظلم کی داستان کو ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔ یہ سب پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بہن زرمین کا چہرہ گھوم گیا۔ زرمین بھی تو کچھ ایسے ہی حالات سے گزری تھی، اور اس کی یادیں ایک کڑوی گولی کی طرح حلق میں پھنس کر مشعل کا دل بے چین کر گئیں۔

"یہ کیس نہیں، یہ ایک جان کا معاملہ ہے۔"

مشعل نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

اسے اپنی بہن زرمین کی خاموش چیخیں اس لڑکی کے کیس میں سنائی دے رہی تھیں۔ جس لڑکی نے اپنی محبت کے لیے سب کچھ داؤ پر لگایا، اسے سہاگ کے نام پر جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اور پھر، اس کی بیٹی...! پیٹ میں ہی دم توڑ دینے والی معصوم بچی!

یہ سطر پڑھتے ہی مشعل کے ہاتھ کانپنے لگے، اس کی آنکھیں غم اور غصے سے نم ہو گئیں۔

یہ سارا احساس، محبت اور زرمین کی یاد کے گہرے تعلق سے جنم لینے والی ایک ایسی آگ تھی جس نے اس کے اندر ایک نیا عزم بیدار کر دیا تھا۔

یہ صرف ایک کیس نہیں تھا، یہ ایک ماں کے دل کا خون تھا جو اس کے سامنے بہہ رہا تھا۔

یہ ظلم کی انتہا تھی، اور اس کا دل چیخ اٹھا کہ اسے کسی بھی قیمت پر انصاف دلانا ہے۔

اس نے گہرا سانس لیا اور اپنی نظریں نازیہ رحمن کے چہرے پر جما دیں۔ اس کی آواز میں غیر معمولی عزم تھا۔

"مجھے معلوم ہے، یہ مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے۔ قانونی پیچیدگیاں اپنی جگہ، لیکن یہ صرف ایک کیس نہیں ہے۔ یہ میرے لیے ذاتی جنگ ہے۔ یہ میرے ضمیر کا بوجھ ہے نازیہ میم۔ یہ ایک آواز ہے جو خاموش نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ایک لڑکی کا حق ہے جو اسے ملنا چاہیے۔ اور سب سے بڑھ کر، یہ ایک بیٹی کا حق ہے جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی چھین لیا گیا۔"

اس کی آواز لرز رہی تھی مگر اس میں ٹوٹی ہوئی ہچکیوں کی جگہ ایک چٹان سا پختہ ارادہ تھا۔

"کوئی یہ کیس لے یا نہ لے، میں اسے لڑوں گی۔ چاہے سب میری مخالفت کریں، میں اس لڑکی کو انصاف دلواؤں گی۔ یہ صرف ایک کیس نہیں ہے، یہ میرا فرض ہے!"

نازیہ رحمن نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ مشعل کی آنکھوں میں لہراتی روشنی، یہ نیا جنون جو اس نے آج تک مشعل میں نہیں دیکھا تھا۔ اسے لگا کہ یہ کوئی عام وکیل نہیں، بلکہ ایک ایسی جنگجو ہے جو میدان میں تنہا کھڑی، اپنے اصولوں اور سچائی کے لیے لڑنے کو تیار ہے۔

:

مشعل کے دفتر میں نازیہ رحمن ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ ایک مدھم سی دستک پر دروازہ کھلا اور ایک نحیف و نزار لڑکی دہلیز عبور کر اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ خوف اور تھکن سے اس قدر بوجھل تھا جیسے برسوں کی نیند اس سے روٹھ گئی ہو۔ آنکھوں میں بے یقینی کے سائے گہرے تھے اور جسم محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ یہ سمیرا تھی، وہی سمیرا جس کا کیس مشعل کے دل میں ایک طوفان برپا کر چکا تھا۔

سمیرا کو اس حالت میں دیکھ کر مشعل کا دل ایک بار پھر پسیج گیا۔ اس کے وجود سے بدحالی چیخ چیخ کر اپنا حال سنا رہی تھی۔ نازیہ رحمن نے سمیرا کا تعارف کروایا اور اسے مشعل کے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مشعل نے نرمی سے اسے پانی پیش کیا اور اپنی دھیمی آواز میں اسے یقین دلایا کہ وہ یہاں بالکل محفوظ ہے۔ سمیرا نے ڈرتے ڈرتے ایک نظر مشعل پر ڈالی اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

"سمیرا، جو کچھ بھی تم پر بیتا ہے، مجھے سب تفصیل سے بتاؤ تاکہ میں تمہیں انصاف دلانے میں تمہاری مدد کر سکوں۔ بے خوف ہو کر ہر بات کہو۔" مشعل نے پر اعتماد مگر شفیق لہجے میں کہا۔

سمیرا نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کے کانپتے ہونٹوں سے ماضی کا کرب ناک افسانہ قطرہ قطرہ ٹپکنے لگا۔

"میرا باپ... وہ انتہائی سخت مزاج تھا۔ میری ماں کو معمولی باتوں پر بھی مار پیٹ کا نشانہ بناتا تھا۔ گھر میں ہر وقت ایک خوف کی فضا طاری رہتی۔ مجھے کبھی آزادی محسوس نہیں ہوئی، دل کرتا تھا کہ کسی طرح اس قید سے نجات مل جائے۔"

اس کی آواز میں ماضی کا خوف نمایاں تھا۔

"پھر... مجھے کاشف سے محبت ہو گئی، مگر میں جانتی تھی کہ میرا باپ کبھی محبت کی شادی کی اجازت نہیں دے گا۔ اسے محبت جیسے رشتے سے ہی نفرت تھی۔ اسی لیے میری چھ ماہ کی محبت میرے والدین کی تیئیس سال کی محبت پر غالب آ گئی، اور میں نے بغیر سوچے سمجھے گھر سے بھاگ کر کاشف سے شادی کر لی۔"

اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا، جیسے وہ اپنے اس فیصلے کی گہرائی کو ماپ رہی ہو۔

"مجھے لگا تھا کہ میں نے اس قید سے آزادی حاصل کر لی ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"مگر... آزادی کی یہ قیمت بہت بھاری پڑی۔ کاشف کا گھر... وہ تو اس سے بھی بڑی قید نکلا۔ میری ساس... اس کا رعب اور دھونس اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ مجھے ہر بات پر طعنے دیتی، گالیاں بکتی۔ کبھی کھانا ٹھیک نہ بنتا تو گرم سالن مجھ پر ڈال دیتی، کبھی چائے گر جاتی تو کھولتی چائے میرے ہاتھ پر گرا دیتی، برتن دھوتے ہوئے ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو کرنٹ لگانے کی دھمکی دیتی، اور معمولی سی بات پر طمانچے رسید کر دیتی۔ اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ نہیں، آگ کے انگارے تھے جو میرے جسم و روح کو جھلسا ڈالتے تھے۔ ایک دن تو... ایک دن تو اس نے میرا ہاتھ چولہے پر رکھ دیا اور کہتی تھی کہ جب تک تو اس گھر میں ہے، ایسے ہی تجھے سزا ملے گی۔"

سمیرا کا چہرہ درد سے بگڑ گیا۔

"کاشف بھی... شروع میں تو اچھا تھا، لیکن پھر وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ مل گیا۔ مجھے مارتا پیٹتا تھا۔" اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے بازو پر پڑی ایک پرانی چوٹ کو چھوا۔

"پھر مجھے پتا چلا کہ میں امید سے ہوں۔ میری بیٹی تھی..." اس کی آواز گھٹ گئی۔

"جب انہیں پتا چلا کہ پیٹ میں لڑکی ہے، تو انہوں نے زبردستی میرا حمل ضائع کروا دیا۔ میری ساس نے مجھے پیٹ پر اتنی زور سے لات ماری کہ میں سیڑھیوں سے لڑھک گئی،

میرا جسم ہر سیڑھی پر ٹکراتا چلا گیا، اور میرے پیٹ میں ہی بچی کا دم گھٹ گیا۔ میرا خون بہنے لگا تھا، ہر طرف لال رنگ تھا، میری اپنی بیٹی جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی قتل کر دی گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک اور بیٹی اس گھر میں آئے۔"

اس کے آنسو بے اختیار بہنے لگے تھے۔

مشعل کی آنکھوں میں نمی سی چھا گئی تھی، جسے چھپاتے ہوئے اس نے گہری سانس لی اور سمیرا کو حوصلہ دیا۔

"مجھے پتہ تھا کہ اب میں وہاں نہیں رہ سکتی تھی، مگر واپس کہاں جاتی؟" سمیرا نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"جب میں گھر سے بھاگی تھی، تو کچھ عرصے بعد مجھے اطلاع ملی کہ میرے باپ نے میری ماں کو طلاق دے دی تھی اور اس کے کچھ عرصے بعد ہی وہ خود بھی انتقال کر گئے تھے۔ میرا گھر ٹوٹ چکا تھا، ماں بے سہارا ہو چکی تھی، اور اب باپ بھی نہیں رہے۔ اب میں نہ گھر جا سکتی تھی اور نہ ہی اپنی ماں کے پاس، کیونکہ وہ بھی طلاق کے بعد اپنی ماں کے گھر چلی گئی تھیں، اور میری حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مجھے اپنے گھر میں پناہ دے سکیں۔ میں ہر طرف سے تنہا اور بے سہارا تھی، مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔"

سمیرا کی آواز میں بے بسی اپنے عروج پر تھی۔

"ایک دن... کاشف مجھے ایک کپل پارٹی میں لے گیا۔ وہاں کاشف کے دوست اپنی بیویوں پر ایسے تبصرے کر رہے تھے جیسے وہ کوئی چیز ہوں۔ میرے شوہر (کاشف) نے بھی ان باتوں کو ہنسی میں اڑا دیا اور جب میں نے انہیں ٹوکنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پارٹی کے دوران، جب میں تھوڑی دیر کے لیے اکیلی ہوئی تو کاشف کے کچھ دوست میرے قریب آ گئے، انہوں نے مجھے ہراساں کرنا شروع کر دیا، میرے جسم کے قریب آنے کی کوشش کی اور... اور...!"

سمیرا کی آواز گلے میں گھٹ گئی، اس کا جسم کانپنے لگا۔ آنکھوں میں خوف اور شرمندگی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی، بس سسکیاں بھرنے لگی، اس کی خاموشی چیخ چیخ کر سب کچھ بتا رہی تھی کہ اس کی عزت پر حملہ کیا گیا تھا، اسے زبردستی کی کوشش کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مشعل کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ یہ سن کر مشعل کا دل بے اختیار غم اور غصے سے بھر گیا۔ یہ ظلم کی انتہا تھی، وہ سمیرا کو دیکھ رہی تھی جس کا جسم اب زخموں کے ساتھ ساتھ ایک روح کی اذیت بھی سہہ رہا تھا۔

سمیرا کی یہ بات سن کر مشعل کا دل بری طرح لرز اٹھا۔ مشعل نے سمیرا کا ہاتھ تھاما۔

"سمیرا، میں تمہارا درد سمجھ سکتی ہوں۔ تم نے جس آزادی کی تلاش میں گھر چھوڑا، وہ تمہیں کہیں اور نہیں ملی، بلکہ ایک نئی قید میں لے آئی۔" مشعل کی آواز میں دھیما پن تھا، مگر الفاظ گہرے تھے۔

"دیکھو سمیرا، وہ بیٹیاں ہی اچھی لگتی ہیں جو اپنے ماں باپ اور ان کی دعاؤں کے سائے تلے رخصت ہوتی ہیں۔ ماں باپ کا گھر قید نہیں ہوتا، وہ تو تحفظ کا قلعہ ہوتا ہے، جہاں کی پابندیاں دراصل محبت اور فکر کی دیواریں ہوتی ہیں۔ تم نے محبت کا انتخاب کیا، اور تمہارا انتخاب غلط ثابت ہوا۔ ہم سب سے غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن سمیرا، انتخاب کسی کا بھی غلط ہو سکتا ہے، چاہے وہ تمہارا اپنا ہو یا تمہارے والدین کا، یہ صرف قسمت پر انحصار کرتا ہے کہ وہ انتخاب صحیح ثابت ہوتا ہے یا غلط۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ماں باپ کبھی بچوں کا غلط سوچتے ہیں۔ البتہ، اگر اپنا خود کا انتخاب غلط ثابت ہو جائے، تب بھی بہت سے ماں باپ اپنی ناراضگی کے باوجود بیٹیوں کے لیے ایک آخری دروازہ کھولے رکھتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ مجبوری بن جاتی ہے اور بیٹی کا سہارا بننا بھی ناممکن ہو جاتا ہے، اور بیٹی ہر طرف سے بے سہارا ہو جاتی ہے۔ میرا بتانے کا مقصد

صرف اتنا ہے کہ، جب ہم اپنا انتخاب خود کرتے ہیں تو وہ بھی تو غلط ہو سکتا ہے، جیسے تمہارے ساتھ ہوا۔" مشعل نے سمیرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"سمیرا، ماں باپ کبھی اپنے بچوں کا برا نہیں چاہتے۔ ان کی سختی ان کی فکر کی عکاسی ہوتی ہے۔ جو پابندیاں تمہیں اس وقت قید لگ رہی تھیں، وہ دراصل تمہیں دنیا کی کڑواہٹوں سے بچانے کی کوشش تھیں۔ اس کیس کا مقصد صرف تمہیں انصاف دلانا نہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ معاشرے کی ہر سمیرا سمجھے کہ ماں باپ کا گھر قید نہیں ہوتا۔ ان کی دعائیں اور ان کا ساتھ ہی بیٹی کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اس کیس میں ہم نہ صرف تمہیں انصاف دلائیں گے بلکہ یہ بھی ثابت کریں گے کہ بیٹیاں اپنے گھر والوں کے سائے میں ہی محفوظ ہیں۔"

سمیرا نے سسکیاں بھرتے ہوئے مشعل کی طرف دیکھا۔ مشعل کی باتوں میں اسے ایک نئی امید اور زندگی کا ایک ایسا سبق نظر آیا جو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلی بار آنسوؤں کے ساتھ ساتھ ایک چمک سی نظر آئی۔

..☆...☆...☆..

رات کی گہری چادر اوڑھے، شہر خموش تھا، مگر مہتاب صاحب کے اندر ایک طوفان مچا تھا۔ ان کی انگلیاں بے تابانہ فون پر ایک نمبر ملاتیں، مگر ہر بار ایک بے روح خاموشی لوٹ آتی۔ امید اور مایوسی کے جھولے میں جھولتے ہوئے، ان کی پیشانی پر فکر کی گہری لکیریں ابھر آئیں، جیسے کوئی ان کہی کہانی ان کے چہرے پر رقم ہو رہی ہو۔ ہر گزرتا لمحہ

ان کے دل میں ایک نیا سوال پیدا کر رہا تھا، ایک ایسا سوال جس کا جواب کہیں دور، کسی اندھیرے کونے میں چھپا تھا۔

:

اسی لمحے، ایک دوسرے جہاں میں، جہاں سناٹا اور تنہائی راج کرتی تھی، یعنی قبرستان میں، بارش کے بے رحم قطرے زمین کو چھو کر ماتم کر رہے تھے۔ ایک بے نام قبر کے سرہانے، ایک لڑکا موجود تھا جس کا چہرہ تاریکی میں پوشیدہ تھا، مگر اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو بارش کے قطروں کے ساتھ مل کر ایک درد بھری داستان رقم کر رہے تھے۔ شراب کی کڑواہٹ اس کے گلے سے اتر رہی تھی، شاید وہ اس کڑواہٹ سے اپنے اندر کے غم کو بھلانا چاہتا تھا۔ قبر پر پڑا فون مسلسل بج رہا تھا، سکرین پر ایک نام روشن تھا، مگر اس روشن نام کو دیکھ کر بھی وہ شخص بے حس تھا، جیسے یہ کال اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

:

اس سب کے ساتھ، ایک تیسری دنیا بھی تھی، ایک بند کمرہ جہاں ہوا بھی سانس لینے سے قائل تھی۔ کمرے میں گہرا اندھیرا چھایا تھا، ہر شے اپنی شناخت کھو چکی تھی۔ اچانک، دروازہ کھلا اور دو ہاتھ اندر داخل ہوئے، جن میں ایک چمکتا ہوا فون تھا۔ فون کی روشن سکرین نے ایک لمحے کو کمرے کے اندرونی حصے کو ہلکا سا روشن کیا، اور اس مدھم روشنی میں ایک مبہم سایہ نظر آیا جو کمرے کے ایک کونے میں ساکن تھا۔ اس سایے نے آہستہ سے مڑ کر چمکتے فون کی طرف دیکھا۔ ایک نسوانی آواز ابھری:

"آپ کی کال آ رہی ہے۔"

فون ٹیبل پر رکھ دیا گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ فون مسلسل بج رہا تھا، اور ہر کال کے ساتھ یہ معمہ مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا کہ آخر یہ پراسرار سایہ کون ہے اور یہ کال کس کی ہے۔

:

تین مختلف دنیاؤں میں پھیلی یہ بے چینی، مہتاب صاحب کی بے قراری، قبرستان میں بجنے والے فون کی گھنٹی کے ساتھ بہتے آنسو، اور تاریک کمرے میں ساکت پراسرار سائے کے ہاتھوں میں بجتی ہوئی فون کی گھنٹی—یہ سب ایک ہی سوال کے گرد گھوم رہے تھے، ایک ایسا سوال جو رات کے اس سناٹے میں کسی ان دیکھی حقیقت کی گہرائیوں میں چھپا ہوا تھا۔ اور ان کی خاموشی اس راز کو مزید گہرا کر رہی تھی۔ یہ تمام مناظر ایک ان کہے راز کے دھاگے سے جڑے ہوئے تھے، ایک ایسا راز جو ہر لمحہ فون کی گھنٹی کے ساتھ زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔

..☆...☆...☆..

آج بھی شمیم کے چہرے پر وہی مانوس مسکراہٹ تھی جو گرلز ہائی سکول کی ساتویں، آٹھویں جماعت کی طالبات کو زندگی کے مشکل ترین حقائق سے روشناس کراتی تھی۔ وائٹ بورڈ پر اس نے بڑے بڑے حروف میں لکھا، "عزت اور امان کی پہچان!" اور ایک جوشیلے انداز میں پوچھا:

"میری پیاری بچیو! ہماری زندگی میں عزت اور امان کا سب سے بڑا مرکز کون سے رشتے ہوتے ہیں؟"

پوری کلاس کی معصوم آوازوں نے ایک ساتھ گونج کر جواب دیا:

"ہمارے والدین!" شمیم کی آنکھوں میں چمک آگئی، "شاباش! اور خاص طور پر ہم بیٹیوں کے لیے، اللہ تعالیٰ نے کن رشتوں میں تحفظ اور عزت کی امان رکھی ہے؟"

ہوا میں لہراتے بلند ہاتھوں نے فوراً جواب دیا:

"باپ اور بھائی میں!"

شمیم نے بچیوں کو دل کھول کر داد دی اور اپنی بات کو مزید گہرائی دیتے ہوئے کہا،

"بالکل صحیح! یاد رکھنا میری بچیو! زندگی میں باپ اور بھائی کے سوا کوئی اور مرد یا لڑکا تمہاری عزتوں کا حقیقی رکھوالا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ نامحرم ہوتا ہے اور تمہاری حفاظت کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی۔ اپنی عزت اور امان کی سب سے بڑی ذمہ داری خود تم پر اور پھر تمہارے خاندان پر ہے، کسی اجنبی پر کبھی بھروسہ مت کرنا۔"

شمیم کا مقصد صرف سماجی اصولوں کی تفہیم کروانا نہیں تھا بلکہ ان ننھے ذہنوں میں تحفظ، عزت اور اپنے رشتے ناتوں کی پہچان کا بیج بونا بھی تھا۔ طالبات ہنستے کھیلتے، مسکراتے ہوئے نہ صرف سیکھ رہی تھیں بلکہ ان کے اندر ایک گہرا علمی اور اخلاقی لگاؤ بھی پیدا ہو رہا تھا۔

چھٹی کی گھنٹی نے سکول میں پھیلی چہل پہل کو ایک دم سے روک دیا۔ شمیم نے پیار بھرے الفاظ سے طالبات کو الوداع کہا اور اپنی کتابیں سمیٹ لیں۔ سکول سے نکل کر وہ گاؤں کی پکی سڑک پر چل پڑی، جہاں دونوں اطراف لہلہاتے دھان کے کھیت تھے اور ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ وہ پکی سڑک پر قدم بڑھاتے ہوئے، اپنی کتابوں پر نظریں جمائے، شاید دن بھر کی تدریس یا آنے والے کل کے منصوبوں میں گم تھی، جب سورج کی سنہری شعاعیں مغرب کی جانب ڈھلتے ہوئے کھیتوں کو ایک دلکش رنگ دے رہی تھیں۔

اچانک، پیچھے سے ایک پرانی سی جیپ بجلی کی سی تیزی سے نمودار ہوئی۔ شمیم کو اس کی آمد کچھ عجیب سی لگی۔ جیپ نے اس کے قریب آکر رفتار کم کی، اور جیسے ہی وہ بالکل اس

کے برابر پہنچی، ایک ہاتھ نے اسے اندر کھینچ لیا۔ یہ سب اس قدر غیر متوقع اور تیز رفتاری سے ہوا کہ شمیم کو سنبھلنے کا ذرا برابر موقع نہ ملا۔ اس کے ہاتھوں سے کتابیں چھوٹ کر سڑک کی دھول میں لت پت ہو گئیں۔ جیپ طوفانی انداز میں آگے بڑھی، پکی سڑک کی دھول فضا میں ایک گھنے بادل کی صورت میں اڑنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے، اس دھول کے غبار میں جیپ اور اس میں شمیم بھی گم ہو گئے۔ پیچھے رہ گئیں تو صرف اس کی گری ہوئی کتابیں، جو خاموشی سے اس ہولناک واقعے کی گواہی دے رہی تھیں۔

..☆...☆...☆..

صحن میں بیٹھی مشعل نے فون کان سے لگایا تو سامنے بکھرے کیس کے کاغذات پر اس کی گہری سوچ کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ قلم اس کے دانتوں میں دبا تھا اور پیشانی پر پڑی شکنیں کسی اندرونی طوفان کی خبر دے رہی تھیں۔ حال ہی میں کی گئی تحقیقات نے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا، مگر اس کے چہرے پر ایک غیر متزلزل ارادے کی جھلک نمایاں تھی۔ دوسری طرف، آئمہ کی آواز فون کے دوسری جانب گہری تشویش لیے ہوئے تھی۔

"مشعل، میں نے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔"

آئمہ نے نرمی سے کہا، اس کی آواز میں ایک دبی ہوئی التجا تھی۔

"نازیہ میم جو بتا رہی تھیں، کیا تم واقعی وہ کیس لے رہی ہو؟"

مشعل نے کاغذات سے نظر ہٹا کر فون کو مضبوطی سے پکڑا۔ اس کی آواز میں ایک پختہ عزم تھا جو کسی بھی دباؤ سے نہ جھکنے والا تھا۔

"ہاں آئمہ، میں یہ کیس ضرور لڑوں گی۔"

آئمہ کی تشویش اور گہری ہو گئی، گویا وہ اپنی دوست کو کسی سامنے کے خطرے سے آگاہ کرنا چاہ رہی ہو۔

"لیکن مشعل، تم سمجھ رہی ہو یہ کتنا مشکل ہے؟" اس نے آہستگی سے کہا، جیسے لفظوں کو تول کر ادا کر رہی ہو۔

"قانونی پیچیدگیاں دیکھو، اس کیس میں جیتنے کے امکانات آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ مخالف اتنا طاقتور اور بااثر ہے کہ اس کے پاس دولت بھی ہے اور رسوخ بھی۔ ہمارے ادارے کے بڑے بڑے وکیل بھی ایسے معاملات سے کتراتے ہیں۔ اور وہ لڑکی... اس کے پاس تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر تم ہار گئیں تو اس کا کیا بنے گا؟ یہ تمہارے کیریئر کا آغاز ہے، مشعل۔ اس کیس میں ناکامی تمہارے لیے بہت بھاری پڑ سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ تم ابھی پیچھے ہٹ جاؤ۔ کوئی اور تجربہ کار وکیل دیکھ لے گا۔"

مشعل کے چہرے پر تلخی چھا گئی، اس کی آواز میں ایک واضح چیلنج تھا۔

"اگر میں کوشش ہی نہیں کروں گی تو کیسے پتا چلے گا کہ میں ہار جاؤں گی؟"

عزم کی چمک لیے وہ تیزی سے اٹھتے ہوتی بولی،

"اور اس لڑکی کے پاس کوئی نہیں ہے، اسی لیے تو مجھے یہ کیس لڑنا ہے! میں نے جو تحقیقات کی ہیں، اس سے مجھے پتہ چلا ہے کہ اس کا شوہر، کاشف، ایک بہت بڑا گینگسٹر اور ریپسٹ ہے!"

مشعل نے انکشاف کیا، اس کی آواز میں نفرت کی لہر دوڑ گئی۔

اسی اثنا میں، شہر کے دوسرے کونے میں ایک پر تعیش سیاہ جیپ سڑکوں پر ایک پراسرار سائے کی طرح گشت کر رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا کاشف، سڑک پر ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ گھور رہا تھا، اس کی خبیث آنکھوں کی جھلک جیپ کے سامنے والے

شیشے میں صاف دکھائی دے رہی تھی جہاں کوئی بھیانک منصوبہ اس کے ذہن میں پنپ رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے شخص کے چہرے پر غصے کی سرخی نمایاں تھی، پیشانی پر گہرے بل پڑے ہوئے تھے، اور اس کی نیلگوں آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ اس کی خمیدہ ناک ہمیشہ کی طرح اس کے تکبر کی نشاندہی کر رہی تھی، مگر آج اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی جو چہرے پر سختی کی بجائے ایک کمینہ پن لیے ہوئے تھی۔ اس کے بال حسبِ معمول بے ترتیبی سے بکھرے تھے، اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور سینے پر بالوں کا جنگل اس کی مردانگی کی غمازی کر رہا تھا۔ اس کے بڑے اور مضبوط ہاتھ جیپ کی سیٹ پر ایسے جمے ہوئے تھے جیسے کوئی شکار کو دبوچنے والا ہو۔ کلائی پر آج بھی وہ موٹی سونے کی چین نمایاں تھی جو اس کی پہچان بن چکی تھی۔

جیپ کے اندر بیٹھے کئی نوجوان لڑکے بے فکری سے قہقہے لگا رہے تھے، ان کے منہ سے نکلنے والے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے جیپ کے اندر ایک گھٹن زدہ ماحول پیدا کر رہے تھے۔ لیکن اس گھٹن میں کچھ اور بھی تھا جو روح کو لرزا دینے والا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک بند بوری میں کچھ ہل رہا تھا، اور اس میں سے کسی لڑکی کی دبی دبی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں، جیسے کسی کا منہ سختی سے بند کر دیا گیا ہو یا اسے رسیوں سے جکڑ دیا گیا ہو۔

کاشف اور اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے ایک دوسرے سے کمینگی بھری ہنسی کے ساتھ ہاتھ ملائے، گویا کوئی گھناؤنا راز انہوں نے آپس میں بانٹا ہو۔ کاشف کے چہرے پر اطمینان اور طاقت کا غرور نمایاں تھا، جبکہ اس کے ساتھ بیٹھے شخص کی نظروں میں ایک گہری چالاکی اور خفیہ منصوبہ بندی چھپی ہوئی تھی۔

یہ وہ خوفناک حقیقت تھی جو مشعل کے علم میں نہیں تھی، مگر یہی وہ تاریک سچائی تھی جس کے خلاف مشعل لڑنے کا ارادہ رکھتی تھی، چاہے اس کی قیمت کچھ بھی ہو۔

"یہ صرف ایک کیس نہیں، آئمہ، یہ انصاف کی جنگ ہے۔ اگر ہم سب ڈر کر پیچھے ہٹ جائیں تو ان ظالموں کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے!"

مشعل کی آواز بلند ہونے لگی۔

"کیا میں اتنی کمزور ہوں؟ کیا میں اس قابل نہیں کہ ایک مظلوم کو انصاف دلا سکوں؟ تم بھی تو وکیل ہو، آئمہ۔ تمہیں تو سمجھنا چاہیے کہ انصاف کتنا ضروری ہے۔"

اسی دوران، مہتاب صاحب کے کمرے کے باہر ایک بھاری بھرکم اور بارعب شخصیت خاموشی سے کھڑا تھا۔ وہ سلمان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت اور مضبوطی کا عکس تھا، اور اس کا انداز کسی بھی صورتحال پر گہری نظر رکھنے والے شخص کا سا تھا۔ مشعل اور آئمہ کی گفتگو کی ہر بات اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی، اور اس کے چہرے پر کسی گہرے تاثر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا، مگر اس کی گہری نظریں کہیں دور خلا میں گھور رہی تھیں۔

آئمہ نے گہری سانس لی۔

"میں سمجھتی ہوں، مشعل۔ لیکن حقیقت پسندی بھی ضروری ہے۔ ہر جنگ جیتنے کے لیے نہیں لڑی جاتی۔" اس کی آواز میں ایک دبا ہوا درد تھا، جیسے وہ اپنی دوست کو کسی اندھی گلی میں جانے سے روک رہی ہو۔

بحث شدت اختیار کر گئی، مشعل کی آواز اب تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ آئمہ کی ہر نصیحت اسے اپنی کمزوری اور ناتجربہ کاری کا طعنہ لگ رہی تھی۔ بالآخر، مشعل نے غصے سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے فون کو اپنے کان سے ہٹایا، "بس کرو آئمہ! تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کال کاٹ دی۔

سلمان نے ایک لمبی سانس لی اور ایک فیصلہ کن نظر دروازے کی طرف ڈالی، جہاں سے مشعل کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں کچھ منصوبے بن رہے تھے۔

..☆...✯...☆..

فون بند کرتے ہی مشعل نے سمیرا کیس کی فائلیں یوں سمیٹیں جیسے ہر ورق میں اس کی بے تاب روح قید ہو۔ اس کا وجود بے اختیاری میں باہر کی جانب لپکا، ہر قدم میں عدالت تک پہنچنے کی جنونی خواہش اور ایک انوکھا، سلگتا جوش عیاں تھا۔ قدم خود بخود تیز ہوتے چلے گئے، لیکن یکایک وہ تھم سی گئی — جیسے کوئی قیمتی اثاثہ اندر ہی رہ گیا ہو۔

"مشعل!"

سلمان کی دھیمی مگر پر تاثیر آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس کی نظر میز پر پڑی مشعل کی بھولی ہوئی فائل پر تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے وہ فائل اٹھائی اور مشعل کے پیچھے دوڑا۔

مشعل مڑی تو سلمان کو ہاتھ میں اپنی فائل لیے دیکھ کر اس کی پیشانی پر ناگواری کے بل پڑ گئے۔ وہ جو پہلے ہی غصے کی چنگاریوں میں لپٹی ہوئی تھی، آج تمام تر عزت و احترام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تلخی سے بولی:

"سلمان بھائی! آپ کو میرا گارڈین اینجل بننے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ کی شدت کسی چیخ سے کم نہ تھی۔

سلمان نے ایک لمحے کے لیے اسے حیرانی سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، جیسے اس نے مشعل کی اندرونی جلن اور طوفانی غصے کو بھانپ لیا ہو۔

"لیکن لٹل، تم اپنی فائل..."

"ہاں تو میں لینے جا ہی رہی تھی نا!"

مشعل نے اسے تیزی سے ٹوکا، اس کی آواز کی حدت مزید بڑھ گئی۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی میرا کام کرنے کی؟ آپ سب کو کیا لگتا ہے میں اپنا کام خود نہیں سنبھال سکتی؟ کیا میں اتنی نااہل ہوں؟"

اس کے تیور غصے سے چڑھے ہوئے تھے، جیسے کوئی بے قابو طوفان اندر ہی اندر کروٹیں لے رہا ہو۔

سلمان کے چہرے پر مشعل کی تلخی اور لہجے کی شدت سے ناگواری کی پرچھائیاں پھیلنے لگیں۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور آنکھوں میں ہلکا سا غصہ جھلکنے لگا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا، اس کے لہجے میں اب سنجیدگی اور ایک پراسرار سی وارننگ اتر آئی تھی۔

"مشعل، میں نے تمہیں فون پر آئمہ سے ہوئی گفتگو سنی۔ یہ کیس جتنا تم سمجھ رہی ہو، اس سے کہیں زیادہ پرخطر اور پیچیدہ ہے۔ تمہیں محض سہاروں کی نہیں، بلکہ مضبوط ترین بنیادوں کی ضرورت پڑے گی کیونکہ اس کا باپ..."

سلمان کی بات ابھی ادھوری تھی کہ مشعل نے اسے جھٹکے سے ٹوک دیا۔

"بس کریں! مجھے کسی کی ضرورت نہیں!"

مشعل نے اس کی بات کاٹی، اس کا چہرہ غصے سے کندن کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

"میں کسی کے باپ سے نہیں ڈرتی، سمجھے آپ؟ اور نہ ہی مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت ہے۔"

غصے میں اس کی آواز بے قابو ہو چکی تھی، اور اسے ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔

سلمان کا صبر اس کی بلند آواز اور مسلسل بد تمیزی سے جواب دے گیا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی اور اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، اس کی آنکھوں میں شدید ترین تاثرات تھے۔

"کسی کے باپ سے نہیں ڈرتیں، لیکن اپنے باپ سے تو ڈرتی ہو نا؟"

اس کی آواز میں ایک ایسی کڑک اور تلخی تھی جو مشعل کے غصے کی ساری آگ کو پل بھر میں ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی تھی۔

"تمہارے اسی باپ کے حکم پر میں تمہیں یہ 'پک اینڈ ڈراپ' کی خصوصی سہولت دینے آیا ہوں! اب چلو میرے ساتھ! ایک لفظ مزید نہیں!"

مشعل ایک لمحے کے لیے ساکت و بے حس کھڑی رہ گئی، اس کی آنکھوں میں نمی کا ایک شفاف پردہ چمکنے لگا۔ سلمان کے تلخ لہجے نے اسے اپنی بد تمیزی کا گہرا احساس دلایا تھا، اور اس احساس کے ساتھ ہی ایک تلخ حقیقت نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا: اسے سلمان کے ساتھ ہی جانا پڑے گا۔ ایک گہرا سانس لے کر وہ بے بسی کی تصویر بنی سلمان کے پیچھے گاڑی کی طرف بڑھی، اس کے قدموں میں ندامت کا ان دیکھا بوجھ تھا۔

گاڑی تیزی سے عدالت کے دروازے پر رکی۔ مشعل نے سرعت سے خود کو گاڑی سے باہر نکالا، مگر سلمان نے پلک جھپکتے ہی گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ مشعل کو ایک لمحے کا بھی موقع نہ ملا کہ وہ سلمان سے اپنی بد تمیزی کی معذرت کے چند الفاظ بھی کہہ پاتی۔ وہ بے سدھ سی کھڑی، پر سوچ نگاہوں سے اوجھل ہوتی گاڑی کو دیکھتی رہی۔

گاڑی چند ہی سیکنڈوں میں نظروں سے غائب ہو چکی تھی، اور اپنے پیچھے مشعل کی پشیمانی چھوڑ گئی۔

مشعل نے بے چینی سے اپنے ہاتھوں میں تھامی فائلیں اور کندھے پر لٹکے بیگ کو دیکھا، ایک کڑوا خیال زہر کی طرح اس کے حلق سے نیچے اترا۔

"اوشیٹ، میری فائل..."

ایک بار پھر وہ اپنی اہم فائل بھول آئی تھی۔ پہلی دفعہ وہ فائل گھر میں بھول گئی تھی، لیکن اس بار جب وہ سلمان کی گاڑی سے اتری، تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنی فائل سلمان کی گاڑی میں ہی بھول گئی ہے۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر، اس نے فوراً ایک آٹو روکا اور سلمان کے دفتر کی جانب بھاگی، اس کے دل میں بے پناہ پریشانی کا طوفان برپا تھا، ندامت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ آج پہلی بار اس نے سلمان سے اس طرح بحث کی تھی، اسے خود پر شدید غصہ اور رونا آرہا تھا کہ آخر اس نے ایسا احمقانہ کام کیا کیوں؟

آٹو جیسے ہی دفتر کے باہر رکا، مشعل بجلی کی سی تیزی سے سلمان کی گاڑی کی طرف لپکی۔ اس نے شیشے کے پار گاڑی کے ڈیش بورڈ پر اپنی فائل دیکھی اور بے ساختہ دروازہ کھولنے کی کوشش کی، مگر گاڑی لاک تھی۔ اب وہ تیزی سے دفتر کے اندر داخل ہوئی، لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی وہ سیدھا سلمان کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اس کے کیبن میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ اچانک کچھ سوچ کر رک گئی اور دروازہ کھٹکھٹا کر اندر سے اجازت کی منتظر رہی۔ اس کے اندر ایک عجیب کشمکش جاری تھی۔

کچھ توقف کے بعد مشعل نے بے چینی سے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا، اس کے اندر کا اضطراب اب بیزاری و ناگواری کی واضح شکل اختیار کر چکا تھا۔ اندر سے مسلسل دستک کی کوفت سہتے ہوئے، سلمان غضب ناک، سرخ انگارہ آنکھوں کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھا۔ جیسے ہی دروازہ کھولا، مشعل کا ہاتھ بے ساختہ سلمان کے ہاتھ سے ٹکرایا۔ اس لمس کے ساتھ ہی جیسے کائنات کی گردش تھم سی گئی، وقت ٹھہر گیا، اور دونوں کے سینوں میں ہزاروں رنگین تتلیاں اپنے پر پھیلانے لگیں، دل گویا پسلیوں کے پنجرے توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو اٹھے۔ اس لمحے، تمام تر غصہ، ساری کڑواہٹ جیسے پگھل

کر عدم ہو گئی۔ ایک پل کو سلمان کی سرخ آنکھوں میں نظریں اٹھاتے ہی، مشعل کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی، وہ تھرتھرا اٹھی، یکلخت اس کے دل میں ایک انوکھا، غیر محسوس خوف سرایت کر گیا۔

"کیا ہوا؟" سلمان نے فوراً پوچھا، اس کی آواز میں حیرت، تشویش اور بے پناہ فکر مندی نمایاں تھی۔ "یوں کانپ کیوں رہی ہو لٹل؟ کیا ہوا۔"

معصومیت نم پلکوں پر سجائے، نظریں اٹھا کر مشعل نے ہکلاتے ہوئے کہا:

"آپ کے غصے سے ڈر لگ رہا ہے۔"

اس کی آواز میں شرمندگی اور خوف کا ایک عجب، دل نشین امتزاج تھا۔

سلمان نے مشعل کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس کی معصومیت پر سلمان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور اس نے اپنا سر جھکا کر، مشعل کی نظروں میں دیکھتے ہوئے دھیمی، گہری آواز میں اعتراف کیا:

"ڈر تو میں بھی گیا ہوں، لٹل۔" اس کے لہجے میں ایک انوکھی صداقت تھی۔

مشعل نے حیرانی کے عالم میں سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیوں؟ آپ کیوں ڈر گئے؟" اس نے بمشکل پوچھا۔

"میں ڈر گیا تھا کہ کسی کا تھاما ہوا یہ ہاتھ اگر چھوٹ گیا تو میں پھر ان اندھیروں میں کہیں واپس نہ چلا جاؤں۔"

سلمان نے کہا، اس کی نظریں مشعل کی آنکھوں میں گڑی تھیں، جیسے وہ اس کی روح کے اندر جھانک رہا ہو، اس کے وجود کی گہرائیوں کو محسوس کر رہا ہو۔ مشعل ہی وہ لڑکی تھی جو سلمان کو اس کے تاریک ماضی کے دلدل سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہی تھی، اور آج سلمان نے نہ صرف مشعل کے تلخ لہجے کی کاٹ محسوس کی بلکہ اس کے لہجے میں چھپی

عجیب سی بے حسی، بے اعتنائی اور بے نیازی نے بھی اس کے دل میں مشعل کے کھو جانے کا گہرا ڈر پیدا کیا تھا۔

یہ مکالمہ ابھی جاری تھا کہ ایک مدھر، پر وقار آواز کے ساتھ ہی مشعل کا ہاتھ سلمان کے ہاتھ سے ایسے چھٹا جیسے کسی کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں پیچھے مڑی تو اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دلکش، حسین اور پر اسرار نسوانی حسن کا سرچشمہ لڑکی کھڑی تھی—ایہا بہلول۔

"ہیلو، سلمان۔"

ایہا نے ایک لمحے کے لیے مشعل پر سرسری، جانچتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر مسکرا کر سلمان کی طرف دیکھا۔ فضا میں ایک عجیب سی، ناگفتہ بہ کشمکش نے جنم لیا۔ جب وہ ایک پر ادا، ریشمی انداز سے ہاتھ لہراتے ہوئے 'ہیلو' کہہ کر ان کی جانب آگے بڑھی، تو ان تینوں کے درمیان ایک نئی، ان کہی اور غیر متوقع داستان کا آغاز ہو چکا تھا۔

جاری ہے۔۔۔۔

..☆...☆...☆..

اپنی قیمتی آراء سے آگاہ کیجیے۔